نگار

سالانہ چندہ

ہندوستان و پاکستان

آٹھ روپیہ آٹھ آنہ (مع سالنامہ)

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ

قیمت فی کاپی ۱۰/

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا ہی اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہی کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس لیے ضخامت بھی زیادہ ہی۔ قیمت چار روپیہ (علاوہ محصول)

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا، ہر افسانہ ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہی۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت چار روپیہ (علاوہ محصول)۔

من ویزداں

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک عنبر فشاں کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کرکے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتے سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہی جس میں مذاہب کی تخلیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی، اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا اور پُرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہی قیمت سات روپیہ آٹھ آنہ مجلد (علاوہ محصول)

مجموعۂ مذہبی استفسارات و جوابات

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہی ان کی مختصر فہرست یہ ہی (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان مجبور ہی یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس و ہارون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) لقمان (۱۶) برزخ (۱۷) یاجوج و ماجوج (۱۸) ہاروت و ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ۔ ضخامت ۲۶۲ صفحات کاغذ سفید و بنیر قیمت پانچ روپے آٹھ آنہ۔

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخی اور انشار لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا، اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشار نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہی۔ قیمت دو روپیہ (علاوہ محصول)

ترغیبات جنسی یا شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ مختصر تبصرہ کیا گیا ہی کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی، نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے، نیا اڈیشن۔ قیمت چار روپیہ۔

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں (۱) چند گھنٹہ فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ (۲) مادین کا مذہب نہایت دلچسپ و مفید کتاب ہی قیمت عہ (علاوہ محصول)

بعض کمیاب کتابیں

(ان کتابوں پر کمیشن نہیں دیا جائے گا ـــــ قیمتیں علاوہ محصول ڈاک ہیں)

تاریخ فارسی

آئینِ اکبری ۲ حصے کامل - - - ابوالفضل - - - ۵۰ھ
توزک جہانگیری (ٹائپ) کامل - - - - - - - - ۳۰ھ
تاریخ گلستانِ ہند - مصور - - - درگاپرشاد - - - - ۳۰ھ
دردِ نادرہ - - - - - - - - محمد مہدی خاں - - - ۱۴ھ
سکندر نامہ مع فرہنگ - - - نظامی - - - - - ۵ھ
تذکرہ دولت شاہ سمرقندی - - - - - - - - ۷ھ
تاریخ حبیب السیر ۲ جلدیں - - غیاث الدین - - - ۷ھ
تاریخ فرشتہ ۲ حصے - - - محمد قاسم - - - - ۵ھ
تذکرہ گلستان مسرت - - - - عبدالرحمٰن - - - - ۲۳۰ھ
تذکرہ علمائے ہند - - - - - رحمان علی - - - - ۵ھ
تذکرہ آتشکدہ آذر - - - - - لطف علی بیگ - - - ۳۷۰ھ
تذکرہ شوکت نادری - - - - - - - - - - ۳ھ
دبستان المذاہب - - - - - مرزا محسن - - - - - ۱۵۰ھ
قصاید عرفی محشی - - - - - جمال الدین - - - - ۳ھ
دیوان ظہیر - - - - - - فاریابی - - - - - ۳ھ
دیوان ناصر علی سرہندی - - - - - - - - - ۴ھ
دیوان بلالی - - - - - - - - - - - - - للعہ
حدیقہ حکیم سنائی - - - - - - - - - - ۲۴۰ھ
دیوان حافظ محشی - - - - - - - - - - - ۷ھ
کلیات غالب - - - - اسداللہ خاں - - - - - ۱۸۰ھ
خونابۂ جگر - - - - - غلام غوث خاں بیخبر - - - ۷ھ
دیوان ظہوری - - - - - نورالدین - - - - - - ۱۵۰ھ
دیوان صائب - - - - - - مرزا محمد علی - - - - ۳ھ
کلیات سعدی شیرازی - - - - - - - - - - ۱۵۰ھ
کلیات مرزا جلال اسیر - - - - - - - - - ۱۵۰ھ

ادب فارسی

دیوان واعظ - - ملا رفیع واعظ کاشفی - - - - - - - ۵ھ
دیوان کلیم - - - ابوطالب کلیم - - - - - - - - - ۵ھ
دیوان شوکت - - - - - - - - - - - - - ۱۵۰ھ
دیوان فطرت - - - - - - - - - - - - - ۱۵۰ھ
دیوان میلی - - - - - - - - - - - - - ۱۵۰ھ
ہفت پیکر - - - مولانا نظامی - - - - - - - - ۳ھ
ہشت بہشت - - - " - - - - - - - - - - ۳ھ
مثنوی قران السعدین - - امیر خسرو - - - - - - - ۵ھ
ہفت قلزم کامل - - - قبول محمد - - - - - - - ۵۸۰ھ
غیاث اللغات مع چراغ ہدایت - - - - - - - - - للعہ
منتخبات الشعراء دارستہ - - - - - - - - - - ۵ھ
منتخب اللغات - - - عبدالرشید - - - - - - - - للعہ
دریائے لطافت - - انشاء اللہ خاں - - - - - - - ۸ھ
فرہنگ جہانگیری ۲ حصے کامل - - - - - - - - ۳۸۰ھ
بہادر شاہ ظفر - - - امیر احمد علوی - - - - - - ۵ھ
مشاہیر اسلام ۲ جلد - - - - - - - - - - ۱۵۰ھ
سیرۃ النعمان شبلی نعمانی - - - - - - - - - ۵ھ
حیات خسرو - - - " " - - - - - - - - ۱۲۰ھ
سوانح مولانا روم " " - - - - - - - - - ۸ھ
حیات سعدی - - - الطاف حسین - - - - - - - - ۵ھ
تذکرۂ آب بقا - - - عبدالرؤف - - - - - - - - للعہ
تذکرۂ ہندو شعراء - - - " - - - - - - - - ۳ھ
تذکرۂ آب حیات - - - محمد حسین آزاد - - - - - - ۹ھ
تذکرۂ شمیم سخن تذکرہ شاعرات - - - - - - - - ۳ھ
تذکرۃ الخواتین - - - - - - - - - - - - ۳ھ

تذکرہ و اصطلاحات شعراء اردو - تاریخ اردو - لغت و اصطلاحات

اردو ادب

عور مقصورات ۔۔۔۔۔۔ افتخار عالم ۔۔۔۔ ۷ے
گلکدہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ محمد ہادی عزیز ۔۔۔۔ ۳ے
دیوان ناسخ ۲ حصے ۔۔۔۔۔ امام بخش ناسخ ۔۔۔ ۱۵ھ
دیوان ذوق ۔۔۔۔۔۔۔۔ شیخ ابراہیم ۔۔۔ ۱ھ
مجموعہ قصائد ذوق ۔ مع ترجمہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۴ھ
دیوان درد ۔۔۔۔۔۔۔۔ میر درد ۔۔۔۔۔ ۲ر
آیات وجدانی ۔۔۔۔۔۔۔۔ مرزا یگانہ ۔۔۔۔ ۸ے
مرقع چغتائی ۔ دیوان غالب ۔ مصور ۔۔۔ محمد عبدالرحمن ۔۔ ۹۰ھ
باقیات فانی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۴ھ
آفتاب داغ ۔۔۔۔۔۔۔۔ نواب مرزا ۔۔۔۔ ۳ے
گلزار داغ ۔۔۔۔۔۔۔۔ " " ۔۔۔۔ ۸ے
انتخاب داغ ۔۔۔۔۔۔۔۔ " " ۔۔۔۔ ۷ے
دیوان ولی معہ دیباچہ حیدر ابراہیم سایانی ۔۔۔۔۔ ۷ے
تاج سخن ۔۔۔۔۔۔۔۔ جلیل مانکپوری ۔۔۔ ۸ے
دیوان ذوق ۔۔۔۔۔۔۔۔ محمد حسین آزاد ۔۔۔ ۸ے
مقدمہ شعر و شاعری و دیوان حالی ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸ے

مرأت الغیب ۔۔۔۔ امیر احمد مینائی ۔۔۔۔۔۔ ۸ے
دیوان قلق ۔۔۔۔ ارشد علی خاں ۔۔۔۔۔۔۔ ۵ر
دیوان شہیدی ۔۔۔ کرامت علی ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲ر
صنمخانۂ عشق امیر مینائی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸ے
دیوان امیر اللہ تسلیم ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵ر
دیوان مجروح ۔۔۔ میر مہدی ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵ر
غنچۂ آرزو ۔۔۔ میر وزیر علی صبا ۔۔۔۔۔۔ ۵ھ
مثنوی میر حسن ۔۔ میر حسن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱ھ
مثنوی گلزار نسیم ۔۔۔ دیا شنکر ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱ھ
مثنوی ترانۂ شوق ۔۔۔ احمد علی ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۴ھ
منتخب لنفایس ۔۔۔ محبوب علی ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵ر
لغات کشوری ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۲ھ
عود ہندی ۔۔۔ اسد اللہ خاں ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳ے
موازنہ انیس و دبیر ۔۔۔ شبلی ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۸ے
رسایل شبلی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵ر
مکاتیب امیر مینائی ۔۔۔ احسن اللہ خاں ۔۔۔۔ ۹ھ

پاکستان میں یہ کتابیں صرف اس صورت سے پہونچ سکتی ہیں کہ پوری قیمت منی آرڈر یا بنک ڈرافٹ پہلے یہاں وصول ہو جائے

"نگار" کے پچھلے پرچے اور سالنامے

ڈاک خانہ کے قواعد جدید کی رو سے اب ذریعۂ پوسٹ روانہ ہوں گے، یعنی ایک پیسہ یا دو پیسہ فی کاپی کی جگہ ایک آنہ فی چھٹانک کے حساب سے محصول ادا کرنا ہوگا اور ۹ فیس رجسٹری و وی پی اس کے علاوہ ادا کئے جائیں گے، اس لئے ہم پچھلے سالناموں کی قیمت میں ۴ر فی کاپی کا اضافہ کرنے پر مجبور ہیں۔ اس صورت میں خریداران نگار سے صرف ۹ فیس رجسٹری لئے جائیں گے اور بک پوسٹ کے مصارف ہم ادا کریں گے۔ یعنی جس سالنامہ کی قیمت دو روپیہ ہے وہ اب ۱۳ھ میں اور جس کی قیمت تین روپیہ ہے وہ ۱۳ے میں وی پی کیا جائے گا۔

اطلاع جاریہ پریس ایکٹ کی دفعہ ۲۰ الف کے تحت قاعدہ نمبر ۸ کے مطابق حسب ذیل معلومات شایع کی جاتی ہیں:۔ "نگار" مہینہ میں ایک بار لکھنؤ سے شایع ہوتا ہے، جس کے مالک اور اڈیٹر نیاز فتحپوری اور پرنٹر و پبلشر قادر علی ہیں۔ یہ ہندوستانی ہیں اور ان کا پتہ:۔ دفتر نگار لکھنؤ ہے۔ میں قادر علی پرنٹر و پبلشر اعلان کرتا ہوں کہ مذکورۂ بالا تفصیلات میری دانست میں صحیح ہیں۔ قادر علی (قادر علی پرنٹر و پبلشر) نشیر آباد۔ لکھنؤ

آیندہ سالنامہ

قرآن نمبر ہوگا یا مصحفی و نظیر نمبر کا دوسرا اڈیشن

قارئین کرام ازراہ کرم اپنی رائے سے مطلع فرمائیں کہ وہ کیا پسند فرماتے ہیں۔ منیجر نگار

حضرات شعراء اس ماہ کی اشاعت میں صفحہ ۳۸ کا مضمون ضرور ملاحظہ فرمالیں اور مصرعۂ طرح پر اپنی غزل زیادہ سے زیادہ ۸ اپریل تک روانہ فرمادیں۔

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ مارچ میں ختم ہوگیا اور اپریل کا پرچہ وی پی روانہ ہوگا۔

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۱۷	فہرست مضامین مارچ ۵۷ء	شمارہ ۳

ملاحظات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اڈیٹر ۔۔۔۔ ۳
داستانِ جرم و تعزیر ۔۔۔۔۔۔۔۔ اڈیٹر ۔۔۔۔ ۶
جلال لکھنوی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ راز یزدانی ۔۔۔۔ ۱۲
اسلامی تعلیمات کا اثر غیروں پر ۔۔۔ ڈاکٹر سعید حسن ۔۔۔ ۲۶
داغ (اپنے خطوط کے آئینہ میں) ۔۔۔ سید محمد رفیق مارہروی ۔۔۔ ۲۸
شعر اور نفسیاتی مطالعہ ۔۔۔۔۔۔۔ اڈیٹر ۔۔۔۔ ۳۸
مشکلاتِ غالب ۔۔۔۔۔۔۔۔ اڈیٹر ۔۔۔۔۔۔ ۴۱
اعتبارات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اڈیٹر ۔۔۔۔۔۔ ۴۵
منظومات ۔۔ فضا ابن فیضی ۔ یحییٰ ۔ عارف ۔ ادیب ۔ ساحر ۔ سرور ۔ اکرم ۔ شفقت ۔ جوہر ۔ سیدہ اختر ۔ سعادت نظیر ۔ متین ۔ شوکت ۔۔۔۔۔۔ ۴۹
مطبوعات موصولہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۳

ملاحظات

مشرقِ وسطیٰ کا خلا

نہر سویز کی نزاع میں، برطانیہ و فرانس کی ناکامی کے بعد، امریکہ کا مشرقِ وسطیٰ کی فضا میں خلا سا محسوس کرنا اور اس خلا کو دور کرنے کے لئے عرب حکومتوں کے سامنے فوجی امداد کی پیشکش، لفظی و اصطلاحی حیثیت سے ممکن ہے کوئی نئی چیز ہو، لیکن معنوی حیثیت سے یہ بالکل وہی چیز ہے جسے ہمیشہ "عدم توازن" سے تعبیر کیا گیا ہے اور جس سے ہمیشہ استعماریت کے بقاو قیام کا کام لیا گیا ہے۔ اسی توازن کو قایم رکھنے کے لئے دنیا کی کمزور قوموں کی قربانی کو ہمیشہ گوارا کیا گیا اور اسی توازن کو خراب نہ ہونے دینے کی خاطر لڑائیاں لڑی گئیں اور آیندہ بھی لڑی جاتی رہیں گی جب تک "سود و زیاں" کے دونوں پلے برابر نہ ہو جائیں۔

یہ عدم توازن یا خلا کیا چیز ہے؟ ۔۔۔ یہ صرف ایک تلخ احساس ہے کسی بڑی قوت کا کہ وہ اپنی حریف قوت کے مقابلہ میں کس قدر کمزور ہے اور اسی کمی کے پورا کرنے کا نام "قیام توازن" یا خلا پُر کرنا ہے پھر عموماً اس کی ایک ہی صورت ہوا کرتی ہے وہ یہ کہ فریقین دوسری کمزور حکومتوں کو زیر اثر لاکر وہاں اپنا تجارتی مارکٹ پیدا کرتے ہیں یا فوجی معاہدوں کے ذریعہ سے اپنے وسایل حرب و دفاع کو زیادہ وسیع بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت نہر سویز کی نزاع کے بعد امریکہ کا مشرقِ وسطیٰ میں خلا محسوس کرکے اس کو پُر کرنا بھی بالکل یہی چیز ہے جو ایشیائی اقوام کے لئے بڑے خطرات اپنے اندر رکھتی ہے۔

نہر سویز کی جنگ سے قبل مشرقِ وسطیٰ میں سب سے زیادہ اثر برطانیہ کا تھا، اس سے کچھ کم فرانس کا اور امریکہ کا نہ ہونے کے برابر۔ پٹرولی چشموں کی وجہ سے سعودی عرب میں اس کے اثرات ضرور قایم تھے، لیکن نہ اتنے کہ وہ شیر برطانیہ سے آنکھ سے آنکھ ملا سکے۔ امریکہ کا یہ

احساس نیا احساس نہ تھا بلکہ وہ عرصہ سے یہ خلش اپنے دل میں لئے ہوئے تھا، جس سے برطانیہ بھی واقف تھا۔ تاہم کوئی صورت ایسی پیدا نہ ہوتی تھی کہ امریکہ اپنے دوست اور حلیف برطانیہ سے اس "تنگیِ دل" کی داد چاہتا اور اس محفل سے اُٹھ جانے کی درخواست اس سے کرتا۔ لیکن اتفاقِ وقت کہئے یا امریکہ کی خوش بختی کہ اسی دوران میں مصر نے نہر سویز کو قومی ملکیت قرار دیدیا اور برطانیہ و فرانس نے اس ضرب کی تاب نہ لاکر مصر پر حملہ کر دیا۔ پھر چاہئے تو یہ تھا اور برطانیہ کو توقع بھی یہی تھی کہ اس کے دوش بدوش امریکی طیارے بھی سرزمین نیل پر پرواز کرتے نظر آئیں گے اور امریکی بیڑے بھی سواحل مصر پر آتشباری میں اس کا ساتھ دیں گے، لیکن امریکہ نے یہ دیکھ کر کہ اسکی تکمیل آرزو کے لئے قدرت اس سے بہتر موقع کوئی اور نہیں دے سکتی، اس نے برطانیہ و فرانس سے صاف صاف کہدیا کہ "مصر کے معاملہ میں، تمہارا ساتھ میں نہیں دے سکتا اور سواحل نیل پر تمہارا یہ جارحانہ اقدام مجھے پسند نہیں"۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ برطانیہ پر اوس سی پڑ گئی اور اس کے بعد سکیورٹی کونسل پر اثر ڈال کر امریکہ نے برطانوی و فرانسیسی فوجوں کو جس طرح مصر سے نکل جانے پر مجبور کیا اس کا حال ساری دُنیا کو معلوم ہے — امریکہ نے یہ سب کچھ کیوں کیا، اس لئے کہ اسے مصر سے بڑی ہمدردی تھی؟، اس لئے کہ اس جور و ظلم کو دیکھ کر اس کے جذبۂ انسانیت میں ہیجان پیدا ہو گیا تھا؟ اس لئے کہ وہ حق و انصاف کو اس طرح پامال ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا؟۔ نہیں، بلکہ صرف اس لئے کہ وہ برطانیہ کے قدم مشرقِ وسطیٰ اُکھاڑ دے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس میں پوری طرح کامیاب ہو گیا۔ برطانیہ کی استعماریت بے نقاب ہو گئی، اس کا سیاسی دیوالیہ پن ساری دُنیا کے سامنے آگیا اور سرزمین عرب کی "جنات عدن" سے ہمیشہ کے لئے اس کو نکل جانا پڑا۔

یہ تھا مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ کا پہلا قدم جس کو اس نے بڑی مضبوطی اور ہوشیاری سے اُٹھایا، لیکن جب قدم اُٹھا تو اُٹھا، رُکتا کیوں؟ ابھی پوری طرح اسرائیلی فوج نے سرزمین مصر کا تخلیہ بھی نہ کیا تھا کہ اس نے شاہِ سعود کو اپنے یہاں قدم رنجہ فرمانے کی دعوت دیدی اور ایک نہایت وسیع سبز باغ دکھا کر ان کو باور کرا دیا کہ اس کا سچا دوست اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ صرف امریکہ ہے اور جب شاہ سعود وہاں سے لوٹے تو امریکہ کے ساتھ فوجی معاہدے کا بڑا واضح تصور ان کے سامنے تھا، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ عرب کی تمام ریاستیں اس پر متفق نہ ہوں گی اور جب تک جملہ عرب حکومتیں راضی نہ ہو جائیں امریکہ اپنا حقیقی مقصود حاصل نہیں کر سکتا۔ اور نہ روس کے بڑھتے ہوئے اثرات جو آہستہ آہستہ مشرقِ وسطیٰ میں بڑھتے جا رہے ہیں، محو کر سکتا ہے، حالانکہ روس کی اس تمام آپا دھاپی کا اصل مقصد یہی ہے۔

یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ جغرافی حیثیت سے مشرقِ وسطیٰ بہ نسبت امریکہ کے روس سے زیادہ قریب کا تعلق رکھتا ہے اور یہ سوویٹ حکومت کی بڑی دیرینہ تمنا ہے کہ وہ اپنے اثرات یہاں وسیع کر سکے کیونکہ اس سرد جنگ میں جو روسی اشتراکیت اور امریکی جمہوریت کے درمیان عرصہ سے قایم ہے، "مشرقِ وسطیٰ" ایک فیصلہ کن عنصر کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی ہمدردی و اعانت کے بغیر، نہ امریکہ کامیاب ہو سکتا ہے، نہ روس۔ اسلئے جس طرح امریکہ نے نہر سویز کے جھگڑے سے فایدہ اُٹھانا چاہا، اسی طرح روس نے بھی اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور اس نے وہ سب کچھ کیا جو اسے کرنا چاہئے تھا، اس نے خود براہِ راست اور زیکِ سلوویکیا کے ذریعہ سے مصر کو کثیر ذخایر حرب فراہم کئے اور اسرائیلی حکومت کے خلاف اردن و شام میں بھی اسلحہ کا انبار لگا دیا، یہاں تک کہ نہر سویز کے مسئلہ میں تو اس نے صاف صاف کہدیا کہ اگر برطانیہ نے مصر کے خلاف اپنی جارحانہ پیش قدمی ختم نہ کی تو عجب نہیں، وہ خود بھی برطانیہ کے سامنے آجائے۔ یہ تمام باتیں ایسی نہ تھیں جن سے عرب ریاستیں متاثر نہ ہوتیں، ہوئیں اور اس طرح کہ آج مصر، شام اور اردن کی طرف سے تو ہر وقت یہی اندیشہ لگا رہتا ہے کہ معلوم نہیں کس وقت وہ سوویٹ برادری میں شریک ہو جائیں۔ یہ تھے وہ حالات جنھوں نے امریکہ کو مجبور کیا کہ وہ عرب ریاستوں کو مالوف کرنے کے لئے کوئی بڑا موثر قدم اُٹھائے — پھر ہو سکتا ہے کہ جس حد تک فوجی خلا کا تعلق ہے، روس و امریکہ اس کے پر کرنے کو دونوں برابر برابر رہیں یا یہ کہ امریکہ کچھ آگے بڑھ جائے، لیکن اس سے بڑا، اس سے کہیں زیادہ اہم خلا ایک اور ہے — اقتصادی و تجارتی خلا — جس کی طرف امریکہ کی نگاہ نہیں گئی اور روس نے اس کو بھی پُر کرنا شروع کر دیا۔

اس سے قبل مشرقِ وسطیٰ کے تجارتی تعلقات سوویٹ بلاک سے بالکل نہ تھے یا اگر تھے بھی تو نہ ہونے کے برابر کیونکہ یہاں کی تمام پیداوار کا

بڑا مارکٹ برطانیہ ہی تھا، لیکن جب نہر سویز کے جھگڑے میں عربوں نے برطانیہ کا بائیکاٹ کر دیا اور اس سے اپنے تجارتی تعلقات منقطع کر دئے تو روس اس اقتصادی خلا کو پُر کرنے کے لئے نہایت تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے شام، لبنان، مصر و اردن کی تمام خام پیداوار کی خریداری شروع کر دی جو اس سے قبل برطانیہ اور دوسرے مغربی ممالک کو بھیجی جاتی تھی۔

شام کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ روئی ہے اور گیہوں جسے برطانیہ خریدتا تھا، اس لئے برطانیہ سے اس کے تجارتی تعلقات ختم ہو جانے پر قدرتاً اسے فکرمند ہونا چاہیئے تھا، لیکن چین نے فوراً اس کی تشویش کو دور کر دیا اور ۵۶ء کی تمام روئی خریدنے کا سودا اس سے کر لیا، اس طرح وہاں کی پیداوار اور گندم کا بڑا حصہ مشرقی جرمنی نے خرید لیا۔ اردن زرعی پیداوار کے لحاظ سے بہت پیچھے ہے، اس لئے زیکوسلوویکیا نے اس کی پوٹاس وغیرہ کا سودا کر لیا اور یمن کی معدنیات کا پتہ چلانے کے لئے اپنے ماہرین بھیجدئے اور بحر احمر کے ساحل پر ایک بندرگاہ کی تعمیر کا وعدہ بھی کر لیا۔ یہ تھے وہ اقدامات سوویٹ بلاک کے مشرق وسطیٰ میں جنھوں نے امریکہ کو سراسیمہ کر دیا اور اس نے گھبرا کر فوجی معاہدوں کے ذریعہ سے عرب ریاستوں کو اپنی گرفت میں لانے کی کوشش شروع کر دی۔ حالانکہ اسے سمجھنا چاہیئے تھا کہ غیر مشروط اقتصادی اور مشروط فوجی امداد میں زمین آسمان کا فرق ہے اور عرب اتنے احمق نہیں کہ وہ اس فرق کو نہ سمجھ سکیں۔

مشرق وسطیٰ کا سب سے زیادہ اُلجھا ہوا مسئلہ اسرائیل حکومت کا مسئلہ ہے جس نے لاکھوں عربوں کو خانماں برباد کر رکھا ہے اور عربوں کے دل سے یہ خلش کبھی دور نہیں ہو سکتی کہ ان کے ملک میں اس اجنبی حکومت کا قیام محض امریکہ کی وجہ سے ہے اور وہ خوب سمجھتے ہیں کہ ان کے حال پر امریکہ کی تازہ عنایتوں کی حقیقت

آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا

سے زیادہ کچھ نہیں۔

مسئلہ کشمیر اس مسئلہ میں اس وقت تک جو کارروائی سکیورٹی کونسل میں ہو چکی ہے، اس کی نوعیت گو ایسی نہیں کہ اسے دیکھ کر جلد اس کے فیصلہ کا یقین کیا جا سکے، لیکن ایک بات ضرور ہوئی ہے اور وہ یہ کہ اس مسئلہ میں جو گتھیاں پڑی ہوئی تھیں وہ ہمارے سامنے آگئی ہیں۔ اس سے پہلے تو یہ پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ ہندوستان کا حقیقی منشاء کیا ہے اور پاکستان اپنی جدوجہد کو کہاں تک لیجانا چاہتا ہے۔

بنیادی نزاع رائے شماری ہی سے تعلق رکھتی تھی اور اب ہندوستان نے یہ کہکر کہ وہ کبھی اس کے لئے آمادہ نہ ہوگا، تصویر کے ایک رُخ کو واضح کر دیا ہے اور پاکستان نے یہ ظاہر کر کے کہ وہ رائے شماری کے اصرار کو سکیورٹی کونسل بلکہ اس سے بھی آگے جنرل اسمبلی تک لیجانا چاہتا ہے اور اگر ضرورت ہو تو تیغ و تفنگ تک بھی، اس کے دوسرے رُخ کو۔

فی الحال تو سکیورٹی کونسل نے اتنا ہی کیا ہے کہ مسٹر جارنگ، ہندوستان و پاکستان آکر خود حالات کا مطالعہ کریں اور فریقین سے گفتگو کرنے کے بعد مفاہمت کے جو امکانات پیدا ہو سکتے ہیں انھیں سکیورٹی کونسل کے سامنے پیش کر دیں، لیکن غالباً سکیورٹی کونسل کی یہ آخری کارروائی نہ ہوگی بلکہ اس کے بعد وہ غور کرے گی کہ آیا کشمیر کے مسئلہ کو بھی وہی حیثیت دیجا سکتی ہے یا نہیں جو نہر سویز یا کوریا کو دی گئی اور اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس وقت پاکستان کو برطانیہ اور امریکہ کی حمایت حاصل ہے اور وہ ہر وقت ایشیا کا امن و سکون غارت کرنے کے لئے آمادہ ہو سکتے ہیں اگر انھیں یہ یقین ہو جائے کہ اس سے ان کا کوئی ادنیٰ سا ادنیٰ مفاد بھی متعلق ہو سکتا ہے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اس وقت تک کوئی قدم نہیں اُٹھائیں گے جب تک مشرق وسطیٰ کے مسئلہ میں انھیں یکسوئی حاصل نہ ہو جائے اور یکسوئی حاصل ہونا بہت مشکل ہے، ان حالات میں یہ پیشین گوئی کرنا کہ کشمیر کا مسئلہ پھر ایک مدت غیر معلوم تک معرض التوا میں پڑ جائے گا، غالباً غلط نہ ہوگا۔ رہا بزورِ شمشیر کشمیر پر قبضہ کرنا سو یہ بات ایسی ہے جسے نہ پاکستان کو اپنی زبان سے نکالنا چاہیئے اور نہ ہمیں اس پر دھیان دینا چاہیئے۔

بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

داستانِ جُرم و تعزیر

(نیاز فتحپوری)

جب انسان نے قبایلی یا عایلی زندگی بسر کرنا شروع کی ہوگی تو اسی وقت زندگی کے کچھ اصول مقرر کرنے کی بھی ضرورت اس نے محسوس کی ہوگی یعنی اس نے طبیعی، معاشی اور اجتماعی مصالح کو سامنے رکھ کر ضرور سوچا ہوگا کہ فلاں فلاں باتوں سے اس کو نقصان پہونچتا ہے اور فلاں فلاں باتوں سے فایدہ اور پھر حالات کے لحاظ سے "سود و زیاں" کے اسباب و مواقع بھی ضرور بدلتے رہے ہوں گے، اس لئے یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے سماجی تنظیم کے کچھ قاعدے مقرر نہ کئے ہوں اور حالات کے لحاظ سے ان قاعدوں میں تبدیلیاں نہ ہوئی ہوں یہی وہ قاعدے تھے جنھوں نے تمدنی وسعت کے ساتھ ساتھ قوانین کی صورت اختیار کی اور سماج کو ان کی پابندی کرنا پڑی۔ پھر جس طرح ہم کو اس کا علم نہیں کہ عہدِ تاریخ سے قبل دورِ وحشت میں انسان نے زندگی کے کیا اصول بنائے تھے اسی طرح عہدِ بعدِ تاریخ کی قوموں کے بارے میں بھی بہت کم معلومات ہم کو حاصل ہیں اور ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ کس قوم نے کس زمانہ میں کیا کیا قوانین وضع کئے اور ان کے عمل و نفاذ کی کیا صورت تھی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان تمام قوانین کی حیثیت زیادہ تر روایتی و انفرادی تھی یعنی وہ صرف ذہنوں میں محفوظ رہتے تھے اور ان کا نفاذ صرف شخصِ واحد سے متعلق ہوتا تھا جیسے قبیلے کا سردار ہونے کی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ بعد کو جب تمدن زیادہ وسیع ہوا، عایلی زندگی نے شہری صورت اختیار کی اور حکومتوں کی بنیاد پڑی تو قانون کا نفاذ، حکمرانوں یا مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں آگیا اور انھوں نے جس طرح چاہا اپنی مرضی سے قوانین وضع کئے۔

الغرض یہ بتانا مشکل ہے، کہ عہدِ قبلِ تاریخ میں مختلف ممالک و اقوام میں کن کن باتوں کو جرم قرار دیا گیا اور ان کے لئے کیا کیا سزائیں تجویز کی گئیں۔ البتہ آغازِ تاریخ کے بعد جو قوانین مرتب کئے گئے ان میں سب کا تو نہیں لیکن بعض کے ریکارڈ ضرور موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ جرم و تعزیر کے باب میں مختلف زمانوں میں مختلف قوموں کا نقطۂ نظر کیا تھا اور انسانی معاشرہ اس سے کس حد تک متاثر ہوا۔

قانونِ حمورابی

سب سے پہلا قانون جو ہم تک منضبط صورت میں پہونچا ہے وہ حمورابی (فرمانروائے بابل) کا قانون ہے جو دو ہزار سال قبلِ مسیح رائج تھا اور جسے قانونِ حمورابی کہتے ہیں۔

حمورابی، ارضِ بابل کا مشہور فرمانروا تھا اور کہا جاتا ہے کہ تاریخ بابل میں بہ لحاظ فراست و ذہانت کوئی دوسرا فرمانروا اس مرتبہ کا نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنا وضع کیا ہوا قانون آٹھ فٹ کے ایک سنگین ستون پر کندہ کرا کے ہیکل مردوک میں نصب کرا دیا تھا تاکہ ہر شخص اس کا مطالعہ کر سکے۔ یہ ستون اب بھی موجود ہے اور ماہرینِ آثار نے اس کے نقوش کا مطالعہ کر کے قانونِ حمورابی پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

اس ستون کے سرے پر سب سے پہلے حمورابی کی تصویر کندہ ہے، اس حالت میں کہ سورج کا دیوتا یہ قانون اُس کے سپرد کر رہا ہے اور اس کے بعد اصل قانون کی تفصیل ہے جو ۳۶۰۰ سطروں میں، ستون کے چاروں طرف منقوش ہے۔

یہ قانون الہامی شریعت کی حیثیت نہ رکھتا تھا بلکہ مجموعہ بالفاظ دیگر تھا اُن بہت سے قوانین کا جو قدیم اقوام میں رائج تھے، جس میں خود حمورابی نے بھی اپنے وضع کئے ہوئے بعض قوانین شامل کر دئے تھے۔ اس ستون کے کتبوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ایسی باتیں جو موجودہ ترقی یافتہ دور کے لئے مخصوص سمجھی جاتی ہیں، اب سے چار ہزار سال قبل عہدِ عتیق کے معاشرے میں بھی پائی جاتی تھیں مثلاً نکاح و طلاق

کے مسئلہ کو لیجئے کہ آج کل تمام مہذب ممالک میں اس کی بنیاد صرف اس اصول پر قایم ہے کہ معاشرے میں مرد و عورت دونوں مساوی درجہ رکھتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو اپنے حقوق کے مطالبہ کا آزادانہ حق حاصل ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ بالکل یہی روح ہمیں قانونِ حمورابی میں بھی ملتی ہے۔ اس میں جہاں معاملات کا ذکر کیا گیا ہے اس امر کا صراحتاً اظہار ہے کہ تجارت و پیشے کی تمام صورتوں میں عورت و مرد برابر کا درجہ رکھتے ہیں اور کسی کو کسی پر تفوق حاصل نہیں۔ اسی کے ساتھ بیواؤں اور یتیموں کی حفاظت و نگہداشت کو بھی قومی فریضے کی حیثیت سے ظاہر کیا گیا ہے۔ البتہ بہ سلسلۂ تعزیرات "آنکھ کے بدلے آنکھ" والی رسم ضرور رائج تھی جسے موجودہ نقطۂ نظر سے ہم وحشیانہ کہہ سکتے ہیں۔

مصر اہمِ سابقہ میں، مصری قوم کو بھی خاص امتیاز حاصل ہے اور وہاں کے آثار سے جو نقوش و کتبات دستیاب ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اب سے پانچ ہزار سال قبل وہاں کی حکومت بھی اپنا ایک خاص آئین رکھتی تھی اور وہ بڑی حد تک بلند اخلاق پر قایم تھا۔ چنانچہ قانونِ حمورابی کی طرح مصری قانون میں بھی عورت کی نگہداشت کا بڑا لحاظ رکھا گیا تھا اور جایداد کی مالک زیادہ تر عورت ہی ہوا کرتی تھی اور اسی کے ترکے سے اولاد مستفید ہوتی تھی۔ اسی طرح شادی کے باب میں بھی وہ کافی آزاد تھی اور جس سے چاہتی شادی کر سکتی البتہ موجودہ اخلاقی نقطۂ نظر کے خلاف یہ رواج ضرور تھا کہ بھائی بہنوں میں بھی آپس میں شادی ہو سکتی تھی اور خصوصیت کے ساتھ شاہی خاندان میں تو یہ رسم ضروری سمجھی جاتی تھی جس کا سبب غالباً یہ رہا ہوگا کہ شاہی نسل کا سلسلہ شاہی خاندان ہی کے اندر رہے اور باہر کا خون اس میں نہ ملنے پائے۔ لونڈیاں رکھنے کی بھی اجازت تھی، لیکن ان کی حیثیت بیویوں کی سی نہ تھی بلکہ بہنوں کی طرح ان کو رکھا جاتا تھا۔

شریعتِ موسوی دنیا کے مشہور واضعینِ قانون میں، حضرت موسیٰ کا بھی شمار کیا جاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے انھوں نے متعدد قوانین وضع کئے تھے۔ لیکن غالباً یہ خیال صحیح نہیں کیونکہ "احکامِ عشرہ" جو توریت میں حضرت موسیٰ سے منسوب کئے جاتے ہیں، وہ بھی دراصل ان کی فکر کا نتیجہ نہ تھے۔ ہر چند احکامِ عشرہ میں جس اخلاقی نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھا گیا ہے وہ حضرت موسیٰ کا نقطۂ نظر ضرور تھا، لیکن یہ احکام ان کے وضع کئے ہوئے نہ تھے۔

قدیم ترین اسرائیلی قانون جو توریت میں درج ہے وہ دراصل بابل و اسیریا کے قوانین کا عبرانی ترجمہ ہے۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ توریت کے یہ تمام احکام ایسے ہیں جو زیادہ تر کاشتکاروں کے لئے موزوں ہیں اور عہدِ موسیٰ میں بنی اسرائیل کاشت سے بالکل ناواقف تھے اور محض خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ توریت میں جن احکام کا ذکر ہے وہ اس عہد سے متعلق ہیں جب بنی اسرائیل نے کنعان میں مستقلاً آباد ہونے کے بعد وہاں زراعت شروع کر دی تھی اور کنعانیوں ہی کے قوانین سے اخذ کر کے یہ احکام وضع کر لئے گئے تھے۔

فلسطین فلسطین کے قانون کے جو حصے ہم تک پہونچے ہیں وہ بہت نامکمل ہیں اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہاں کے معاشرتی قوانین کیا تھے، لیکن جہاں تک تعزیرات کا تعلق ہے ان سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ "قصاص بالمثل" کو اس میں زیادہ اہمیت حاصل تھی، یعنی اگر کوئی شخص کسی کو اذیت پہونچاتا تو اسی قسم کی اذیت مجرم کو بھی پہونچائی جاتی، لیکن اس کا نفاذ زیادہ تر غلاموں یا آزاد شدہ غلاموں پر ہوتا تھا۔ اگر کوئی آزاد اسرائیلی غلام کی آنکھ نکال لیتا یا ناک کاٹ ڈالتا تو اس کی آنکھ، ناک کو کوئی گزند نہ پہونچتا بلکہ اس کو صرف یہ سزا دی جاتی کہ وہ غلام کو آزاد کر دے۔

اگر آقا اپنے غلام یا نوکر کو سخت جسمانی اذیت پہونچاتا اور وہ ایک دن تک زندہ رہتا تو آقا سے کوئی باز پرس نہ ہوتی۔ اگر وہ اذیت کے صدمے سے بارہ گھنٹے کے اندر مر جاتا تو بھی اس کا قصاص نہ ہوتا اور کوئی معمولی سی سزا کافی سمجھی جاتی۔

غلامی کا رواج وہاں عہدِ مسیح میں بھی جاری رہا اور گو عیسوی تعلیم کی روح غلامی کے منافی تھی، لیکن مسیح نے اس قسم کی مخالفت نہیں کی اور مسیح کے بعد پال نے تو ارسطاطالیس اور افلاطون کی طرح اس کے قیام پر اور زیادہ زور دیا۔

قدیم یونان یونان کی قدیم رزمیہ داستانوں الیڈ (Iliad) اور اوڈیسی (Odyssey) سے (جو ہومر سے منسوب کی جاتی ہیں اور جن کا زمانۂ تصنیف نویں صدی قبل مسیح ظاہر کیا جاتا ہے) قدیم یونان کے قوانین پر ضرور کچھ روشنی پڑتی ہے، لیکن ساتویں صدی مسیح سے پہلے وہاں کوئی قانون باضابطہ مدوّن نہ ہوا تھا۔

سب سے پہلا شخص جس نے وہاں قانون وضع کیا۔ زیلوکس (Zaleucus.) تھا۔ اس کا زمانہ ۶۶۳ سال قبل مسیح تھا۔ اس سے پہلے وہاں سزا و تعزیر کا کوئی قاعدہ مقرر نہ تھا بلکہ ججوں کو اختیار تھا جس کو جو سزا چاہے دیں، چنانچہ وہ ایک ہی قسم کے دو مجرموں کو وہ مختلف سزائیں دے سکتے تھے، لیکن زیلوکس نے اس خود رائی کا سدِ باب کر دیا اور ہر جرم کی سزا متعین کر دی۔

اس کے بعد ڈراکو (Draco.) نے جو یونان کا بہت بڑا مقنن سمجھا جاتا ہے ۶۲۱ ق۔م میں تمام مروجہ قوانین پر نظرِ ثانی کر کے ان کو از سرِ نو مرتب کیا اور قانون کا نفاذ غیر ذمہ دار ہاتھوں سے نکال کر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا جو عوام کے نزدیک ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے تھے۔

ڈراکو کے بعد جب وہاں کے مشہور مقنن سولن (Solon.) کا زمانہ آیا تو اس نے ۵۹۴ ق۔م میں بالکل نیا نظامِ عدل و انصاف قائم کیا۔ اس نے ڈراکو کے قوانین میں سوا اس حصہ کے جو قتل و سزائے قتل سے متعلق تھا، باقی تمام ضوابط کو بدل دیا اس نے ایک عدالتِ اپیل بھی قائم کی جو عوام کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی تھی اور اسمبلی کی بنیاد بھی اس نے ڈالی جس میں یونان کا ہر بالغ مرد شریک ہو سکتا تھا، لیکن باوجود ان تمام اصلاحات کے اس کا وضع کیا ہوا قانون اس کی موت سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔

قبرص قبرص یا کریٹ کے قدیم شہر گورٹن (Gortyn.) کے کھنڈروں سے چند تختیاں دستیاب ہوئی ہیں جن سے وہاں کے قوانین پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ یہ دو مختلف زمانوں سے تعلق رکھتے ہیں، ایک ۵۰۰ ق۔م سے ۲۰۰ ق۔م تک، دوسرا ۴۵ ق۔م سے اس کے بعد تک کا اور اسی دوسرے زمانہ سے ان تختیوں کا تعلق ہے جو وہاں دستیاب ہوئی ہیں۔

ان کتبات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اس قدیم زمانہ میں بھی بڑی شائستگی پائی جاتی تھی۔ مثلاً جرمِ زنا کی سزا وہاں صرف یہ تھی کہ زانی کو صرف نقد معاوضہ ادا کرنا ہوتا تھا اس طرح اور بہت سے سنگین جرائم کی سزا صرف جرمانے تک محدود تھی۔

شادی شدہ مملکت کے بارے میں بھی ان کا نقطۂ نظر بہت وسیع تھا اور شادی شدہ عورت کی ملکیت کو شوہر کی دست برد سے بچانے کے لئے بھی خاص قاعدے مقرر تھے۔ اس کے علاوہ ترکہ میں لڑکوں اور لڑکیوں کا برابر کا حصہ دار قرار دینے کی بھی دفعات اس قانون میں موجود تھیں۔

رومی قانون سرزمینِ مغرب میں سب سے زیادہ مشہور رومہ کا قانون ہے جس کی تعلیم اب تک یورپ کے بعض ممالک میں رائج ہے۔ قدیم رومہ کا سب سے پہلا قانون وہ ہے جو ۴۵۰ ق۔م میں وضع کیا گیا۔ اول اول یونانی قوانین ہی کو سامنے رکھ کر اسے بنایا گیا تھا، لیکن بعد کو اس میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں۔ جب مملکتِ رومہ وسیع ہوئی تو یورپ اور بحرِ روم کے ممالک پر بھی رومی قانون چھا گیا۔ ہر چند رومہ والے جب کسی ملک کو فتح کرتے تھے تو وہاں کے قانون یا رسم و رواج کو منسوخ نہیں کرتے تھے لیکن پھر بھی ان پر رومی قانون کا بہت اچھا اثر پڑتا تھا اور آخر میں اسی کو اختیار کر لیا جاتا تھا۔

چوتھی صدی کے آغاز میں جب کانسٹین ٹائن اعظم نے قسطنطنیہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو یہاں کے عیسائیوں اور یہودیوں کے بڑھے ہوئے اقتدار کے زیرِ اثر رومی قانون میں بہت رد و بدل کیا گیا اور ۵۳۸ء میں شہنشاہ تھیوڈیسیس نے مزید اصلاحات اس میں کیں۔ اس کے بعد ۵۲۷ء میں دوسرے فرمانروا جسٹی نین نے اس کو اور زیادہ وسعت دی اور یہ قانون اتنا مقبول ہوا کہ اس وقت بھی اکثر ممالکِ مغرب کے قوانین کی بنیاد اسی پر قائم ہے۔

اول اول رومی قانون کی رُو سے ملکیت و اقتدار کا حق صرف باپ کو حاصل تھا یہاں تک کہ افرادِ خاندان کی موت و زیست بھی اسی کے ہاتھ میں تھی اور وہ جس کو چاہتا غلاموں کی طرح فروخت کر کے اس کی جایداد پر قابض ہو سکتا تھا۔ عورت کی قسمت کا فیصلہ بھی جب تک شادی نہ ہو، باپ ہی کے ہاتھ میں تھا۔ البتہ شادی ہونے کے بعد یہ اقتدار باپ سے شوہر کی طرف منتقل ہو جاتا تھا۔ بعد کو جب رفتہ رفتہ اہلِ رومہ مہذب ہوتے گئے اور عیسوی عہد آیا تو عورت بھی زیادہ آزاد ہوتی گئی اور وہ غلامانہ قیود جو اس پر قائم تھیں ختم ہونے لگیں۔

تعذیب و تعزیر تاریخ عدل و انصاف کا وہ حصہ جو تعزیرات سے تعلق رکھتا ہے، اس میں شک نہیں بڑا دردناک حصہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان عہدِ وحشت کے بعد بھی عرصے تک درندہ بنا رہا اور اس کی خوئے درندگی نے بہت زمانے تک اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔

عہدِ قدیم میں مجرموں کو جسمانی عذاب میں مبتلا کرنا عام بات تھی، شاید ہی کوئی قوم ایسی ہو جس نے اس وحشت کا ثبوت نہ دیا ہو۔ عراق، مصر، یونان، روما، چین، جاپان غرض ہر جگہ رواج تھا کہ مجرموں کو جسمانی اذیتیں پہونچائی جائیں، جن کا تعلق سزا اور اقبالِ جرم دونوں سے تھا۔ یعنی اگر صرف پاداشِ جرم میں کوئی جسمانی اذیت پہونچائی جاتی تو بھی غنیمت تھا، لیکن وہاں تو فراہمیِ ثبوت اور اقبالِ جرم کے لئے ایسی سخت تکلیفیں پہونچائی جاتی تھیں کہ ان کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شکنجوں میں کس کر جسم کی رگیں توڑ دینا، ناخن میں کیلیں ٹھونکنا، بھاری بھاری پتھر گلے میں لٹکا دینا سُرخ تپتی ہوئی آہنی چادروں پر لٹا دینا، ایک ایک کرکے اعضاء قلم قطع کرنا، دار پر چڑھانا اور صحرائی درندوں کے سامنے ڈال دینا، یہ تھے تمام طریقے تعذیب و تعزیر کے جو زیادہ تر غلاموں یا آزاد شدہ غلاموں پر صرف ہوتے تھے۔

تعذیب عہدِ عیسوی میں

ہر چند مسیح کی تعلیم یکسر رحم و محبت تھی لیکن ان کے ماننے والے مذہبی رہنماؤں نے عیسویت کی اشاعت کے لئے جو مظالم روا رکھے وہ چہرۂ انسانیت کے ایسے مکروہ داغ ہیں جن کی مثال کسی قوم کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ آگ میں ڈال دینا، گلا گھونٹ گھونٹ کر ہلاک کر دینا؛ اعضاء کاٹ ڈالنا، آنکھیں نکال لینا، پتھر مار مار کر جان لے لینا، پانی میں ڈبو دینا، پہاڑیوں کی چوٹیوں سے نیچے ڈھکیل دینا، یہ اور اس قسم کی بہت سی باتیں عیسائی پیشواؤں کا معمول تھا جسے وہ بڑا کارِ ثواب خیال کرتے تھے۔ پھر یہی نہیں کہ یہ سب کچھ یونہی بغیر کسی قاعدہ یا قانون کے ہوتا ہو، بلکہ اس کے قواعد مقرر تھے اور ایک خاص محکمۂ تعذیب ہی علٰحدہ قائم تھا، جس سے ان وحشیانہ مظالم کے احکام جاری ہوتے تھے۔ اس محکمۂ تعذیب اور ان علمبردارانِ مذہب نے صدیوں تک جن جن عذاب میں انسان کو مبتلا رکھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسپین کے شعبۂ تعذیب کے ایک افسر نے جس کا نام ٹامس ٹورکوماڈ تھا اپنے ۱۸ سال کے دورِ اقتدار میں دس ہزار دو سو بیس انسانوں کو آگ سے جلا جلا کر ہلاک کرنے کا مقدس فرض انجام دیا۔

پھر یہی نہیں کہ یہ دورِ تعذیب صرف چند سالوں تک قایم رہا ہو، مسلسل صدیوں تک یہ سلسلہ جاری رہا اور بمشکل تمام واٹرلو کی لڑائی کے بعد ۱۸۱۶ء میں یہ داغ کلیسائے روم کی پیشانی سے مٹا۔

تعذیب کے قوانین سب سے زیادہ سخت جرمنی و آسٹریا میں تھے۔ ریاستہائے جرمنی میں شکنجوں میں کس کر رگیں توڑ دینا، جسم میں میخیں ٹھونک ٹھونک کر ہلاک کرنا۔ آگ میں سلاخیں گرم کرکے جسم کے اندر بھونکنا سولھویں صدی عیسوی میں مسلسل دو سو سال تک وہاں کا دستور رہا ہے، بلکہ ایک جرمن ریاست بارڈن میں تو ۱۸۳۱ء تک یہی سلسلہ قایم رہا۔ پروشیا میں البتہ ۱۸۴۰ء میں تعذیب کا رواج عملاً ختم ہو گیا لیکن قانونی حیثیت اس کی ۱۸۰۵ء تک قایم رہی اطالیہ میں بھی قانونِ تعذیب کی قانونی حیثیت اٹھارھویں صدی کے آخر تک قایم رہی بلکہ نیپلس میں تو ۱۸۵۹ء تک اس پر عمل ہوتا رہا، فرانس میں البتہ اس کا رواج زیادہ نہیں رہا تاہم تیرھویں صدی سے اٹھارویں صدی کے آخر (۱۷۸۹ء) تک تعذیب وہاں کے قانون میں شامل تھی۔

روس میں بھی انیسویں صدی کے وسط تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ البتہ اس درمیان میں ملکہ کیتھرائن ثانی نے والیٹر (مشہور فرانسیسی ادیب و مصلح) کی تحریروں سے متاثر ہو کر اس قانون کے نفاذ میں کچھ نرمی اختیار کی۔ سویڈن میں یہ قانون رائج تھا لیکن اس پر زیادہ سختی سے عمل نہ ہوتا تھا۔ انگلستان کا بھی یہی حال تھا، لیکن اسکاٹ لینڈ اس باب میں زیادہ سخت تھا اور وہاں سلسلۂ تعذیب عرصہ تک قایم رہا۔

ایشیا میں چین و جاپان خصوصیت کے ساتھ اس باب میں بہت بدنام تھے اور وہاں بھی مجرموں کے ساتھ نہایت وحشیانہ سلوک کیا جاتا تھا۔

قیدخانوں کی ابتداء

مجرموں کو سزائے قید دینا حال کی بات ہے، روما میں ایک مجرم صرف اس وقت تک قید رکھا جاتا تھا جب تک وہ سزائے تعذیب میں مبتلا رہتا تھا۔ اس کے بعد اگر وہ اپنی انتہائی سخت جانی سے زندہ رہ جاتا تو چھوڑ دیا جاتا۔

ہر چند قید و زنداں کا تصور مسیح کے ایک ہزار سال بعد پیدا ہو گیا تھا، لیکن پانچ چھ سو سال تک قیدخانوں کا عدم و وجود برابر تھا۔ سب سے پہلے ۱۵۹۳ء میں امسٹرڈم کے پروٹسٹنٹ پادریوں نے مجرم عورتوں کی اصلاح و تادیب کے لئے ایک باقاعدہ قیدخانہ تعمیر کیا اور اس کے بعد دوسرے ملکوں میں اس کی پیروی کی گئی لیکن ان قیدخانوں کی اندرونی حالت حد درجہ دردناک تھی اور قیدیوں کے ساتھ جانوروں سے زیادہ برا سلوک کیا جاتا تھا جیلروں کو نگرانی کا کوئی معاوضہ نہ ملتا تھا وہ قیدیوں سے جو چاہتے وصول کرتے اور اپنے صرف میں لاتے۔ اس بدتمیزی کی طرف سب سے پہلے جان ہاورڈ کو توجہ ہوئی

اس نے جیلیروی کا مشاہرہ مقرر کرایا اور انتہائی کوشش کے بعد ۱۸۱۶ء میں قید خانوں کا ایکٹ پاس کرایا جو اس سلسلے میں اصلاح کا پہلا قدم تھا

سزائے موت

اول اول انگلستان میں سزائے موت بہت معمولی بات تھی اور تقریباً دو سو جرائم ایسے تھے جن کی پاداش میں سزائے موت کا حکم سنایا جا سکتا تھا، لیکن اس سے زیادہ عجیب سزائے موت کا طریقہ تھا۔ پھانسی گلے میں ڈال کر یعنی گلا گھونٹ کر ہلاک کرنا، برطانیہ کا پرانا دستور تھا۔ لیکن یہ بات اسی جگہ ختم نہ ہو جاتی تھی۔ جان نکلنے کے بعد مجرم کی لاش کو پا بہ زنجیر حالت میں شارعِ عام پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ بغاوت کے مجرموں کو زیادہ تر آگ میں ڈال کر ہلاک کیا جاتا تھا اور کبھی کبھی تیشے سے اس کی گردن مار دیتے۔

سڑکوں پر گھسیٹ گھسیٹ کر مار ڈالنے اور جسم کو چورنگ (چار ٹکڑے) کرنے کی رسم بھی انگلستان میں رائج تھی اور سب سے پہلا شخص جس کو ۱۲۸۴ء میں اس قسم کی سزا دی گئی ویلس کا شاہزادہ ڈیوڈ تھا۔ سب سے پہلے اس کا پیٹ پھاڑ کر اس کی آنتوں کو اس کے سامنے جلایا گیا، اس کے بعد اس کا سر کاٹ ڈالا اور جسم کو چورنگ کیا گیا۔

گردن مارنے کا وہ طریقہ جسے گلوٹین (Guillotine) کہتے ہیں اسی نام کے ایک انگریز ڈاکٹر سے منسوب ہے جو اس کا موجد سمجھا جاتا ہے لیکن انگلستان میں اس کے شروع ہونے سے بہت پہلے فرانس میں یہی طریقہ رائج تھا۔

اس کی صورت یہ تھی رکلٹری کا ایک بڑا چوکھٹا زمین پر نصب کر دیا جاتا اور اس چوکھٹے میں اوپر کی طرف ایک بہت بڑا وزنی چھرا رسیوں کے سہارے سے لٹکا دیا جاتا۔ چوکھٹے کے نیچے مجرم کو آنکھ پر پٹی باندھ کر بٹھا دیا جاتا اور چھرے کی رسّی ڈھیلی کر دی جاتی اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ چھرا مجرم کی گردن پر آ گرتا اور سر فوراً کٹ کر علیحدہ ہو جاتا۔

تیشہ یا تبر سے گردن مارنے کا رواج سب سے پہلے رومیوں اور یونانیوں کے یہاں شروع ہوا۔ اس کے بعد دوسرے ملکوں میں رائج ہو گیا، چنانچہ فرانس اور انگلستان میں بہت سے امراء اور بادشاہوں کی گردن تیشے ہی سے اڑائی گئی۔

اسرائیلیوں میں سزائے موت بہت سے جرائم کی سزا تھی اور اس کا زیادہ مقبول طریقہ سنگسار کرنا یا آگ میں ڈال دینا تھا۔ بابل میں پانی کے اندر ڈبو کر ہلاک کرنے کا طریقہ زیادہ اچھا سمجھا جاتا تھا اور اسیریا میں گرم سلاخیں بھونک بھونک کر جان لینا زیادہ پسندیدہ امر خیال کیا جاتا تھا۔

قدیم روما میں کبھی کبھی یہ بھی ہوتا کہ مجرم کو پہاڑوں کی چوٹی سے نیچے ڈھکیل دیتے وہاں کوڑے مارنے کا بھی وحشیانہ رواج تھا جس سے بمشکل ہی کوئی جانبر ہو سکتا تھا۔ یہاں ایک اور عجیب قاعدہ یہ تھا کہ اگر کوئی شخص اپنے باپ کو مار ڈالتا تو اسے ایک بندر، ایک کتے، ایک مرغ اور ایک سانپ کے ساتھ ایک بورے میں باندھ کر پانی کے اندر ڈبو دیتے۔

کوڑے مارنے کی سزا انگلستان میں بہت سخت تھی۔ کوڑے میں کچے چمڑے کے نوکدار تسمے لگے ہوتے تھے جن کی ہر ضرب سے جسم کا گوشت کٹ کٹ کر چاروں طرف پھیل جاتا تھا۔

روس میں بھی بہ عہدِ زار کوڑے مارنے کا رواج پایا جاتا تھا۔ یہاں کوڑے کے تسموں میں نوکیلے خاردار لوہے کے آنکڑے بندھے ہوتے تھے جو جسم کے اندر پیوست ہو جاتے تھے اور جب وہ باہر آتے تو گوشت کے ٹکڑے بھی اپنے ساتھ لے آتے۔

کوڑے مارنے کی سزا جسمانی اذیت پہونچانے کے لحاظ سے، بڑی ظالمانہ سزا تھی، لیکن انسان یہ سب کچھ دیکھتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔

اس بیان سے واضح ہو گیا ہوگا کہ انسان کو اذیت پہونچانے میں خود انسان نے کتنی بے رحمی سے کام لیا اور عہدِ تہذیب و تمدن میں بھی اس کی درندگی کم نہ ہوئی تھی۔ لیکن یہ دورِ شقاوت اب ختم ہو چکا ہے اور سزا کے مسئلہ پر زیادہ علمی طریقے سے غور کیا جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ رفتہ رفتہ سزائے موت ساری دنیا سے اٹھ جائے اور قید خانے جو مجرموں کو صرفِ محنتِ شاقہ میں مبتلا کرنے کے لئے بنائے گئے تھے اصلاح خانوں میں تبدیل کر دئے جائیں جہاں مجرموں کی ذہنیت کی اصلاح نفسیاتی طور پر کی جائے اور وہ ایک مفید شہری بننے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کر سکیں۔ (آجکل)

جلالؔ لکھنوی

(رازِ یزدانی)

نام :۔ حکیم میر ضامن علی ـــ تخلص :۔ جلالؔ ـــ والد کا نام :۔ حکیم میر اصغر علی خاں داستان گو۔ قوم :۔ سید
مذہب :۔ امامیہ (اثنا عشری شیعہ) ـــ سال پیدائش :۔ ۱۸۳۴ء مطابق ۱۲۵۰ھ ـــ مقام پیدائش :۔ لکھنؤ
تاریخِ انتقال :۔ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۰۹ء مطابق ۱۳۲۵ھ ـــ مقام انتقال :۔ لکھنؤ ـــ عمر :۔ ۷۵ سال۔

تعلیم تعلیم کے متعلق صرف اتنا معلوم ہوسکا ہے کہ آصف الدولہ کے مدرسہ میں تعلیم پائی۔ خمخانۂ جاوید[1] کے مولف نے لکھا ہے کہ: "شاعری کے شوق کی وجہ سے آصف الدولہ کے مدرسہ میں کتب درسیہ کی تکمیل نہیں ہوسکی" یہ بھی کسی تذکرے سے معلوم نہیں ہوتا کہ طب کس سے حاصل کی البتہ اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ جلالؔ کے دادا حکیم سید حسین علی خاں حکیم شفائی کے شاگرد اور شاہی شفاخانہ (لکھنؤ) میں ملازم تھے۔ اس طرح طبابت پیشہ آبائی ہے گویا جلالؔ نے اپنے والد سے طب حاصل کی اور انھوں نے اپنے باپ سے اور جلالؔ کے بیٹے حکیم میر مہدی کمالؔ نے خود جلالؔ سے لیکن جلالؔ یا جلالؔ کے والد حکیم میر اصغر علی خاں داستان گو کے مطب کا ذکر کہیں نہیں ملتا بلکہ جلالؔ کے والد سے ملازمت کا سلسلہ چلتا ہے اور جلالؔ تادمِ مرگ ملازم اور وظیفہ خوار رہتے ہیں لیکن تعلیم کا باقاعدہ ریکارڈ نہ ہونے کے باوجود یہ بھی تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ تحقیق الفاظ۔ لغت۔ قواعد زبان اور عروض کی پابندی میں جلالؔ اپنے تمام معاصرین سے ممتاز تھے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جلالؔ نے درسیات کی بھی تکمیل کی اور اپنے مطالعہ کو بھی بقدر ضرورت وسعت دی

پیشہ اور ذریعہ معاش خم خانۂ جاوید کے فاضل مولف کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ جلالؔ کا پیشہ طبابت تھا، جلالؔ ۲۲ سال کی عمر یعنی ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۶ء میں رام پور آئے۔ رام پور میں ان کے والد پہلے سے موجود تھے، اگر حکیم اصغر علی خاں کے رام پور آنے کا واقعہ جلالؔ سے صرف ایک سال پہلے کا بھی مان لیا جائے کیونکہ بدقسمتی سے حکیم اصغر علی خاں کے رام پور آنے کی صحیح تاریخ تلاش و جستجو کے باوجود نہیں مل سکی۔ تو بھی ۲۰ یا ۲۱ سال کے ایک نوجوان کا طب میں کامل ہوکر مطب چلا لینا عام طور پر ناقابلِ قبول ہے اور جیسا کہ آگے لکھا جائے گا، جلالؔ کی زندگی کی ابتداء ایک داستان گو کی حیثیت سے ہوئی اور ایک وظیفہ خوار شاعر کی حیثیت سے ان کی زندگی ختم ہوگئی۔

وضع قطع اور عادات اخلاق جلالؔ کا قد میانہ اور رنگ گندم گوں تھا۔ لکھنوی وضع کی سختی سے پابندی کرتے تھے اونچی چولی کا انگرکھا چوڑی مہری کا پائجامہ اور دوپلی ٹوپی، بذلہ سنج، خوش مذاق اور وضعدار لوگوں میں جلالؔ کا شمار ہوتا تھا الفاظ کی تحقیق کا بڑا شوق تھا۔ شعر کا روکھا پن گوارا کرسکتے تھے مگر بوجہ قواعد کی پابندی سے ذرا بھی گریز غیر ممکن تھا، مزاج میں خودداری تھی لیکن بیشتر یہ خودداری خود پرستی اور خودی کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ شاعری میں تو ان کی خودی غرور کی حد سے بھی گزر گئی تھی ہر شاعر کو وہ اپنے مقابلہ میں ہیچ سمجھتے تھے اسی خودداری نے ان کو نازک مزاج بنا دیا تھا اور شاعری کے متعلق گفتگو میں تو بہت جلد مشتعل ہوجاتے تھے۔ پروفیسر حامد حسن صاحب قادری نے کراچی سے جلالؔ کی نازک مزاجی کے کچھ قصے میری درخواست پر بھیجے ہیں جو انہی کے الفاظ میں درج کئے جاتے ہیں :۔

---

[1] خم خانۂ جاوید جلد اول صفحہ ۲۳۹

(۱) نوح ناروی تلمیذ داغ دہلوی نے لکھا ہے کہ پہلی مرتبہ وہ لکھنؤ گئے تو از راہِ عقیدت جلال لکھنوی کی خدمت میں نیازمندانہ حاضر ہوئے اور ان کی زبان سے اُن کا کلام سننے کی خواہش ظاہر کی جلال نے اتفاق سے وہ غزل سنائی جس پر داغ کی بھی غزل تھی، بے خیالی میں نوح نے اس بات کا تذکرہ کر دیا۔ بس پھر کیا تھا جلال آگیا برس پڑے "مقدر کی بات ہے کہ داغ حیدر آباد میں عیش کر رہا ہے اور جلال لکھنؤ میں تباہ ہے" وغیرہ وغیرہ سب کہا اور اسی وقت نوح ناروی کو گھر سے نکال دیا۔ نوح کمرے سے نکل کر باہر ایک کونے میں کھڑے ہو رہے کہ شاید غصہ ٹھنڈا ہو جائے اور بلائیں مگر وہ آگ بگولا ہو رہے تھے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا نوح کو کھڑا دیکھا تو پھر لال پیلے ہوئے اور یہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔[1]

(۲) جلال کی بدمزاجی کا ایک اور لطیفہ ہے لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں جلال۔ عشق۔ تعشق وغیرہ استاد جمع تھے، ترتیب نشست اس طرح تھی کہ سب سے آخر میں سید حسین لطافت (امانت کے بیٹے) اور ان سے پہلے جلال تھے جب شمع جلال کے سامنے آئی تو انھوں نے پڑھنے سے انکار کیا اور لطافت نے اصرار کیا تو جلال نے کہا کہ میں تو سب کے بعد پڑھا کرتا ہوں اس پر لطافت کو طیش آگیا کہا کہ حکیم صاحب اسی وقت دوات قلم۔ کاغذ لے کر مقابلہ کر لیجئے اور دونوں کی غزلیں اہل مشاعرہ کے سامنے رکھ دیجئے۔ جلال نے اس رائے سے اتفاق نہ کیا اور لطافت اور عشق و تعشق وغیرہ مشاعرے سے اُٹھ گئے۔

(۳) بدمزاجی کا یہ بھی لطیفہ ہے کہ رام پور کے مشاعرے میں داغ نے مطلع پڑھا ؎

یہ تری چشم فسوں گر میں کمال اچھا ہے
ایک کا حال بُرا۔ ایک کا حال اچھا ہے

سب نے تعریف کی لیکن جلال نے داد دینے میں بخل کیا اور جب ان کی باری آئی تو یہ شعر پڑھا:-

دل مرا آنکھ تری دونوں ہیں بیمار مگر
ایک کا حال بُرا۔ ایک کا حال اچھا ہے

یعنی ہمارا مضمون بہتر ہے۔ مصرع اس طرح لگانا چاہئے، میں (قادری صاحب) کہتا ہوں کہ اس سے جلال کی سخن سنجی پر حرف آتا ہے، داغ کے مقابلہ میں جلال نے نہایت عامیانہ بات کہی ہے دل اور آنکھ کی بیماری بالکل پامال مضمون ہے یہ بات ہر کوئی کہہ سکتا ہے، داغ نے چشم فسوں گر کا جو کمال دکھایا ہے وہاں تک جلال کی نظر نہ پہونچی۔ اگر پہونچی اور پھر بھی اپنا شعر پڑھا تو اس سے زیادہ بدذوقی کیا ہوگی ؎

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد
عیب نماید ہنرش در نظر

حسد کی آنکھ پھوٹے۔ ورنہ جہاں واقعہ یہ ہے کہ داغ کی شوخی کا جواب نہیں وہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ جلال کی لطافتِ فکر بجائے خود ایک کمال ہے طرحی غزلوں میں جلال کی بعض ایسی غزلیں اور ایسے اشعار ہیں کہ امیر و داغ ان سے کمتر نظر آتے ہیں۔

شاعری کی ابتداء

شاعری کا شوق جلال کو ابتدائے سن تمیز سے ہوا اور سب سے پہلے وہ امیر علی خاں ہلال کے شاگرد ہوئے۔ اس زمانہ میں جلال کا آبائی مکان پارمحلہ لکھنؤ میں تھا جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اس خاندان سے چھوٹا۔ بیاض سخن۔ سخن شعرا اور خمخانۂ جاوید وغیرہ میں امیر علی خاں ہلال کا اتنا ہی حال لکھا ہے کہ اُن کے والد کا نام تراب علی خاں تھا، شاعری میں رشک کے شاگرد تھے اور صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں۔ بہرحال ہلال نے ان کی چند غزلیں دیکھ کر یہ اندازہ کر لیا کہ جلال کے کلام کی اصلاح میرے بس کی نہیں ہے اور اپنے ساتھ لے جا کر جلال کو اپنے استاد میر علی اوسط رشک کا شاگرد کرا دیا۔[2]

---

[1] حالانکہ داغ حیدر آباد میں بڑی حسرت سے کہہ رہے تھے کہ ؎

اے داغ ہے دکن سے بہت دور لکھنؤ — ملتے امیر احمد و سید جلال سے

[2] رسالہ معیار لکھنؤ۔ جلد (۱) نمبر (۲) کا یہ قول ہے لیکن عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ سفر عراق پر جانے سے پہلے جلال کو خود رشک نے اپنے استاد بھائی فتح الدولہ برق کے سپرد کیا تھا

رشک کچھ مدت بعد سفرِ عراق کو چلے گئے اور جلال فتح الدولہ برق سے اصلاح لینے لگے۔

میر علی اوسط رشک کا سفرِ عراق ۱۲۶۶ھ کا واقعہ ہے۔ خود جلال کے دوسرے دیوان "کرشمہ گاہ سخن" میں جو ۱۳۰۱ھ میں مطبع فیض محمدی لکھنؤ سے شایع ہوا ہے، رشک کے سفرِ عراق کی تاریخ موجود ہے جس کا مصرعۂ تاریخ یہ ہے کہ :-

کربلا جاتے ہیں دیکھو قبلہ و کعبہ مرے ۱۲۶۶ھ

جلال کی پیدائش ۱۸۳۴ء مطابق ۱۲۵۰ھ کی ہے اور ۱۲۶۲ھ میں بعمر ۲۲ سال جلال رام پور آگئے ہیں گویا جلال اپنے استاد کے سفر کے وقت، ۱۶ سال کے تھے اس لحاظ سے جلال کا رشک کے سامنے زانوے ادب تہ کرنا ۱۲۶۶ھ یا ۱۲۶۵ھ کی بات نظر آتی ہے گویا جلال نے پندرہ سال کی عمر میں شعر کہنے کی ابتدا کی انتزاع سلطنت لکھنؤ کے بعد ہی ۱۸۵۶ء[1] مطابق ۱۲۷۲ھ میں جلال رام پور آگئے۔ خم خانہ جاوید جلد دوم میں خدا جانے یہ کس حوالے سے لکھا گیا ہے کہ ۱۲۷۲ھ میں نواب یوسف علی خاں نے رام پور بلا لیا مگر وہ دو مہینے بعد مر گئے ۱۲۷۲ھ مطابق ہوتے ہیں ۱۸۵۶ء کے اور فردوسِ مکاں نواب یوسف علی خاں ناظم کا عہدِ حکومت ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء سے شروع ہو کر ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۵ء تک رہا۔ یہ تو صحیح ہے کہ جلال ۱۸۵۶ء میں رام پور آئے مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ جلال کے رام پور آتے ہی فردوس مکاں کا انتقال ہو گیا۔ اگر اس سے مراد فردوس مکاں کے والد نواب محمد سعید خاں بہادر ہیں تو اُن کے عہد میں جو ۱۸۵۵ء میں ختم ہوتا ہے جلال کا رام پور آنا نہیں ثابت ہوتا بلکہ تذکرۂ کاملانِ رام پور صفحہ ۱، وغیرہ کی رو سے غلط ٹھہرتا ہے، بہر حال جلال رام پور میں ایک شاعر کی حیثیت سے نہیں آئے تھے بلکہ واقعہ یہ تھا کہ جلال کے والد حکیم میر اصغر علی خاں داستان گو دربار رام پور میں داستان گو کی حیثیت سے ملازم تھے چنانچہ رضا لائبریری کے قلمی داستانوں کے ذخیرے میں ترجمہ ایرج نامہ اس تفصیل سے کہ پہلی جلد ۳۶۵ صفحہ قلمی دوسری جلد ۳۵۱ صفحہ قلمی تیسری جلد ۳۴۶ صفحہ قلمی چوتھی جلد ۳۳۶ صفحہ قلمی اور پانچویں جلد ۳۰۲ صفحہ قلمی ان کے نام سے موجود ہیں اور پانچویں جلد کے آخر میں یہ عبارت درج ہے :-

"تمام شد ایرج نامہ در زبان اُردو بحسنِ سعی احقر العباد ہیچ مدان کج مج بیان حکیم سید اصغر علی داستان گو بحکم نواب معلی القاب محمد کلب علی خاں بہادر دام اقبالہٗ بروز جمعہ دوازدہم ذی الحجہ ۱۲۸۵ھ"

اور بالا باختر کا ترجمہ تین جلدوں میں اس تفصیل سے ہے کہ پہلی جلد صفحہ ۳۷۶ قلمی دوسری جلد قلمی صفحات ۲۸۸ اور تیسری جلد قلمی صفحات ۲۱۵ حکیم سید ضامن علی جلال کے نام سے موجود ہے اس کی پہلی جلد میں یوں ابتدائے کلام کی گئی ہے[2]:-

"پہلے ہزار داستانِ تقریر کو حمد میں اس بہار پیرائے گلستانِ الوہیت کی نغمہ سنج کیا جاتا ہے جس نے زبان کو رنگ اور بیان کو نیرنگ عطا فرمایا اور طوطی قلم نعت میں اس سرو سبز قبائے سرو ستان رسالت کی زمزمہ سرا ہوتا ہے جس نے حدیث بلاغت کو آب و رنگ فصاحت سے بھر دیا بعد اس کے عرض کرتا ہے یہ خوشہ چین ارباب کمال سید ضامن علی تخلص بہ جلال کہ جب ایرج نامہ کی اُردو کرنے سے فرصت ہوئی سرکار فیض آثار سے دفتر سوم یعنی کتاب بالا باختر رنگنے (ع) کے واسطے عنایت ہوئی اگرچہ یہ ہیچ مدان کج مج زبان لیاقت نثر طرازی اور قابلیت انشا پردازی نہ رکھتا تھا مگر تعمیلِ حکم سے چارہ نہ ہوا؟"

رام پور میں جلال کی آمد کے متعلق بزرگوں سے بھی یہی روایت سنی گئی ہے کہ ان کے والد حکیم میر اصغر علی خاں داستان گو اکثر داستان سناتے وقت جب ترجمہ کا ذکر آتا تو اپنے بیٹے جلال کا ذکر کر دیتے تھے آخر سنتے سنتے فردوس مکاں کو اشتیاق ہوا اور انھوں نے جلال کو بلانے کا حکم دیدیا چنانچہ انتخاب یادگار طبقہ دوم صفحہ ۱۰۳ پر امیر مینائی نے جلال کے متعلق لکھا ہے :-

جلال[3]۔ میر ضامن علی خلف حکیم اصغر علی بزمانہ حضرت فردوس مکان جناب نواب محمد یوسف علی خاں بہادر انار اللہ برہانہ میں پہلے انکے

---

[1] نگار مارچ ۵۳ء۔ مقالہ یادِ رفتگان صفحہ ۹ — [2] ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترجمہ داستان میں باپ بیٹے دونوں مل کر کام کیا کرتے تھے۔ بلکہ اغلب یہ ہے لکھنے کا کام سب جلال کرتے ہوں اور دربار میں داستان گوئی حکیم میر اصغر علی کے سپرد ہو — [3] اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جلال بھی بزمرۂ داستان گویاں طلب ہوئے تھے۔

والد ملازم سرکار دولت مدار ہوئے پھر قدر دانی سے یہ بھی طلب ہو کر نمک خوار ہوئے اب تک دونوں مورد مراحم سلطانی ہیں
شکر گزار قدر دانی و پرورش سرکاری ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ صرف ۱۲۶۵ھ بموجب تحریر ایرج نامہ سنہ ۱۲۹۰ھ سال تالیف انتخاب یادگار تک جلال کے والد نہ صرف زندہ تھے بلکہ داستان گویوں میں ملازم تھے اور یہ صحیح ہے کیونکہ جلال کے والد کا انتقال ۱۲۹۶ھ میں ہوا ہے اور جلال نے ان کے انتقال کی تاریخ کہی ہے جس کا مصرعۂ تاریخ یہ ہے :-[1] قبلہ گاہ من بفردوس آہ رفت ۱۲۹۶ھ

زمانۂ نواب کلب علی خاں بہادر تک جلال کی ملازمت باقی رہی گو جلال کئی بار ناراض ہو ہو کر لکھنؤ چلے چلے گئے مگر بلا بلائے گئے اور ایام غیر حاضری کی تنخواہ بھی دی جاتی رہی جلال کے رام پور سے ایک بار بلکہ یوں کہئے کہ پہلی بار خفا ہو کر چلے جانے کا واقعہ یوں کہا جاتا ہے کہ دربار میں کسی لفظ پر بحث چلی۔ نواب صاحب بہادر نے مولوی غیاث الدین (صاحب غیاث اللغات) کے حوالے سے دلیل دی جلال نے نہ صرف اس لفظ کے متعلق غیاث کی رائے کو ماننے سے کر دیا بلکہ پوری کتاب یعنی غیاث اللغات کے بارے میں درباری آداب کی حدود سے گزرے ہوئے الفاظ میں اظہار رائے کیا آداب دربار کی اس خلاف ورزی پر مسند شاہی کی طرف سے ناپسندیدگی کا اظہار ہوا جو محض تادیبًا تھا لیکن جلال اس کو اپنے مستقبل کے لئے تباہ کن سمجھ کر احتیاطًا رام پور سے چلے گئے۔[2]

بہر حال عہد خلد آشیاں میں کئی بار ایسا ہوا لیکن اُن کی رحلت کے بعد جلال رام پور سے مستقلاً چلے گئے۔ چنانچہ تذکرہ "گلِ رعنا" صفحہ ۴۲۸ میں ہے کہ جلال کو سو روپیہ ماہوار رام پور سے ملتے تھے اور :-

چند مرتبہ مستعفی ہو کر چلے گئے مگر نواب صاحب نے ایام معزولی تنخواہ بھی دی اور ہر مرتبہ بلوا بھیجا۔

لیکن نواب کلب علی خاں بہادر کے بعد یہ صورت نہیں رہی۔ جلال لکھنؤ گئے اور منصور نگر میں ایک مکان خرید کے مستقل سکونت اختیار کر لی کچھ زمانہ تک وجہ معاش صرف یہ رہی کہ منگرول[3] کے نواب حسین میاں صاحب ۲۵ روپیہ ماہوار بھیجتے تھے اور ہر قصیدے پر سو روپیہ بلکہ دستور یہ تھا کہ جلال منگرول جاتے تو پچاس روپیہ ماہوار پاتے آخر نواب حامد علی خاں بہادر کے عہد میں جلال دوبارہ رامپور آئے اور پچاس روپیہ ماہوار مقرر ہو گیا اس میں رام پور کی حاضری شرط نہیں تھی اس لئے وہ رہے تو لکھنؤ میں مگر چھٹے مہینے وظیفہ لینے رام پور آتے تھے اور یہاں ایک مہینہ رہتے تھے یہ دستور ان کی موت تک قایم رہا اور وظیفہ بھی آخر تک ملتا رہا۔

رام پور میں جلال کی سکونت

رام پور میں آکر جلال نے سب سے پہلے ملا ملوک کے گھیر میں محمد شاہ خاں کاوش کی نشست گاہ کے نچلے حصے میں قیام کیا کچھ دنوں کے بعد محلہ کٹڑہ جلال الدین خاں میں ایک خاں صاحب، وزیر خاں کا مکان کرایہ پر لے لیا اور وہاں اپنے والد کے ساتھ رہتے رہے۔ دوبارہ آنے پر محمد شاہ خاں کاوش کے یہاں ہمیشہ قیام ہوا۔

جلال کی مشغولیت

صبح سے بارہ بجے تک جلال داستان کے ترجمہ کا کام کرتے تھے چار بجے دربار میں حاضر ہوتے شام کو محمد شاہ خاں کاوش کے مکان پر آتے اور اندھیرا پڑے تک گھر ملا ملوک کے بڑے پھاٹک میں مونڈھوں پر نشست رہتی جس میں چند شاعر اور شہر کے دوسرے شرفا بھی شریک ہوتے، کاوش کے یہاں سے جلال اُٹھتے تو احمد حسن خاں عروج[4] کے مکان پر جاتے جہاں دوسروں کے شعر بھی سنتے اور

---

[1] مسدس بے نظیر مرتبہ اثر رام پوری میں بھی دفتر داستان گویاں میں حکیم اصغر علی خاں کے انتقال کی تاریخ ۱۲۹۶ھ ہی لکھی گئی ہے۔

[2] ان حالات کے لئے محترمی ظفر شاہ خاں صاحب کا شکر گزار ہوں جو محمد شاہ خاں کاوش کے صاحبزادے ہیں اور گھیر ملا ملوک میں رہتے ہیں اصلاح اور خطوط وغیرہ اور دربار رام پور سے جلال کی پہلی گریز کے متعلق مجھے سب کچھ ظفر خاں صاحب ہی نے بتایا ہے۔

[3] کہا جاتا ہے اور واقعہ ہے کہ خلد آشیاں کے بعد جلال رام پور سے مانگرول گئے مگر وہاں اختلاف آب و ہوا کی وجہ سے مستقلاً نہیں رہ سکے۔

[4] احمد حسن خاں عروج ابن محمد حسن خاں۔ مقام پیدائش فرخ آباد تھا اور خود کان پور میں رہتے تھے جہاں غالبًا کسی مطبع میں ملازم تھے یہ آسیوں مضافات لکھنؤ کے شیوخ میں سے تھے۔ ابتدا میں شیخ ناسخ سے براہ راست اصلاح لی تھی اور اُن کی رحلت پر میر علی اوسط رشک کے تلامذہ میں داخل ہو گئے تھے ۱۸۷۲ء میں رام پور آئے اور ریاست کے کسی محکمہ میں ملازم ہو گئے۔

خود بھی اپنا کلام سُناتے آپس میں سب کے شعروں پر تنقیدیں ہوتیں اور ان کے جوابات سُن کر فیصلہ کیا جاتا، جلال کی اس مشغولیت میں موسمی تغیرات اثر انداز نہیں ہوتے تھے، جاڑا گرمی برسات ہر حالت میں یہ روزانہ کا معمول تھا ہاں کسی مجبوری مثلاً بیماری یا سفر کی اور بات تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جلال شاگردوں سے تحفے وصول کئے بغیر توجہ سے اصلاح نہیں دیتے تھے اور جواب کے لئے ٹکٹ نہ آئے تو خط کے جواب سے بھی کتراتے تھے۔

اولادیں تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ جلال نے تین لڑکے اور ایک لڑکی چار اولادیں چھوڑیں اور ایک لڑکا کمسنی میں داغِ مفارقت دے گیا جس کے مرنے کی تاریخ دیوان میں موجود ہے۔ بڑے لڑکے کا نام منے صاحب تھا۔ منجھلے لڑکے سید محمد مہدی کمال تھے اور تیسرے لڑکے کا نام محمد عباس تھا۔ جلال کے داماد کا نام میر محمد نظیر تھا جو مقال تخلص کرتے تھے۔ جلال کے داماد منصور نگر کی چڑھائی پر کہیں رہتے تھے جلال کی بیٹی ۱۹۲۶ء تک زندہ تھیں، مقال کی کہی ہوئی ایک تاریخ جلال کے تیسرے "دیوان مضمونہائے دلکش" کی تاریخوں میں شامل ہے۔ جلال کے بڑے بیٹے منے صاحب کے مزاج میں نسوانیت زیادہ تھی وہ چھپ چھپا کے رنگین کپڑے اور چوڑیاں بھی پہن لیا کرتے تھے۔ جلال نے بیجپوری میں اُن کی شادی رام پور کے ایک شریف شیعہ خاندان میں کردی جس کا حوالہ دینا فضول ہے، بہرحال دُلہن سسرال گئی اور واپس آکر میکے کی ہو رہی۔ شریف زادی نے تمام عمر اپنے بھائی کی کفالت میں گزار دی نہ منے صاحب کو از خود طلاق دینے کی توفیق ہوئی نہ مظلوم سید زادی نے اپنی زبان سے طلاق مانگی۔ جلال کے منجھلے بیٹے سید محمد مہدی کمال شاعر تھے اور اپنے باپ کی طرح تحقیق و جستجو کا ذوق بھی رکھتے چنانچہ حروف کے طریقۂ استعمال میں ان کی ایک تالیف دستور الفصحا ہے جو یوسفی پریس لکھنؤ میں چھپی تھی، کمال مشاعرے میں ترنم سے پڑھتے تھے جلال کے انتقال کے بعد رام پور میں پچاس روپیہ ماہوار پہ ملازم ہوگئے تھے، ملا ملوک کے گھیر میں بشیر خاں کے مکان میں کرایہ پر رہتے تھے مگر زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہے ۱۹۱۱ء کی وبائے عام میں ان کا انتقال ہوگیا اور باغ مہدی علی خاں (بیرونِ بلاسپور دروازہ) کے قبرستان میں دفن ہوئے، کمال کے ایک بیٹے اختر حسن تھے جو شعر و سخن سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے یہ عدالت دیوانی لکھنؤ میں ملازم تھے ۱۹۲۴ء تک ان کے زندہ ہونے کا پتہ چلتا ہے جلال کے تیسرے بیٹے محمد عباس نہ شاعر تھے نہ رام پور میں مستقلاً رہے۔

تلامذہ جلال کے بہت سے شاگرد ہیں جو ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن ان سب میں سید انور حسین آرزو لکھنوی ممتاز تھے ان کے بعد احسان علی خاں احسان شاہ جہاں پوری ہیں جن کا ذکر اُردو کے تذکروں میں ہے اور ان کا یہ شعر مشہور ہے ؎

اس کو نہ سوچئے کہ کرم یا ستم ہوا　　خنجر اُٹھائیے سرِ تسلیم خم ہوا،

رام پور میں جلال کے سب سے اچھے شاگرد محمد شاہ خاں کاوش تھے جن کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا۔ اُن کے چار قلمی دیوان تھے، کیونکہ وہ خوش فکر ہونے کے ساتھ ساتھ زود گو بھی تھے لیکن تین دیوان ضایع ہو چکے ہیں اور چوتھا بھی ناتمام اور نامکمل صورت میں ان کے بیٹے ظفر شاہ خاں کے پاس موجود ہے دو شعر ان کے مجھے بھی یاد ہیں ؎

آپ کے بس کا نہیں میرے گریباں کا رفو　　آپ کے ہاتھ نہ رہ جائیں گریباں ہو کر

وہ مٹتا ہے ہزاروں کو مٹا کر　　یہی پہچان ہے اس نقشِ پا کی

جلال کے ایک اور شاگرد مرتضیٰ حسین وصال[1] بھی تھے جو ریاست کی فوج میں حولدار تھے مگر داستان گوئی کی خدمت بھی ان سے متعلق تھی۔ رام پور لائبریری میں ان کی تالیفات سے کئی قلمی جلدیں داستان کی ہیں ان کے علاوہ جلال کے اور کئی شاگرد تھے جن میں محمد مہدی مہدی۔ وارث حسین شائق اور احمد یار خاں مضطر ممتاز تھے۔

جلال کی تصنیفات

جلال کی تعلیم کا ریکارڈ تو مبہم ہے مگر جلال کی تصنیفات سے اُن کے مطالعہ کی وسعت ظاہر ہوتی ہے جو داستانوں کے علاوہ حسب ذیل ہیں :-

---

[1] وصال کے بیٹے بھی شاعر تھے ان کا نام تصدق حسین اور تخلص نہال تھا یہ آخر میں مجھ سے اصلاح لینے لگے تھے پرانے خیال کے اور محدود قابلیت کے آدمی تھے اور ایسے ہی شعر کہتے تھے لیکن ان کے بیٹے اور وصال کے پوتے مہدی حسین ہلال خوش فکر شاعر ہیں غزل سے زیادہ نظم کہتے ہیں اور نظم طنز و مزاح میں مجھ سے مشورہ کرتے ہیں۔

پہلا دیوان شاہد شوخ طبع — مطبع انوار محمدی لکھنؤ سے ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء میں طبع ہوکر شایع ہوا
دوسرا دیوان ۔ کرشمہ گاہ سخن — مطبع فیض محمدی لکھنؤ سے ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء میں طبع ہوکر شایع ہوا
تیسرا دیوان ۔ مضمونہائے دلکش — انوری پریس گولہ گنج لکھنؤ سے ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۸ء میں طبع ہوکر شایع ہوا
چوتھا دیوان ۔ نظم نگارین — تصویر عالم پریس لکھنؤ سے ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء میں طبع ہوکر شایع ہوا

ان چار دیوانوں میں تقریباً ہر مروجہ صنف نظم پر طبع آزمائی کی گئی ہے ان کے علاوہ

سرمایۂ زبان اُردو ۔ لغت میں
تنقیح اللغات ۔ ایسے الفاظ کی تصحیح میں جو اکثر غلط اعراب کے ساتھ بولے جاتے ہیں
کارآمد شعراء ۔ تذکیر و تانیث میں
منتخب القواعد ۔ قواعد اُردو میں

یہ سب جلال کی شایع شدہ تالیفات ہیں جو نہ صرف مبتدیوں بلکہ منتہیوں کے لئے بھی دلچسپی سے خالی نہیں ان کے علاوہ جلال کی تالیفات میں ایک غیر مطبوعہ تالیف مجموعہ اشعار نامی ہے جس کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری میں موجود ہے اس میں جلال نے بڑی محنت سے غزل۔ قصائد اور مثنویات سے مختلف عنوانات کے تحت اشعار جمع کئے ہیں مثلاً :-

حمد از غزلیات ۔ حمد از مثنویات ۔ نعت از غزلیات ۔ نعت از قصاید ۔ نعت از مثنویات ۔ منقبت حضرت علی از غزلیات ۔ منقبت حضرت علی از قصائد ۔ منقبت حضرت ابوبکر از قصائد ۔ منقبت حضرت عمر از قصائد ۔ منقبت حضرت عثمان از قصائد ۔

اور اسی طرح ۔ اشعار مزاقیہ از غزلیات و قصاید و مثنویات پھر قصائد و مثنویات سے تیر اندازی ۔ خیمہ ۔ بازار ۔ فوج ۔ توپ خانہ وغیرہ وغیرہ ۔ اسی طرح ۔ مثنویات سے ۔ مانجھا ۔ چوتھی ۔ چالا اور میلوں کی تعریف اس کتاب کے ۳۲۷ صفحات ہیں اور اس لحاظ سے ایک نادر تالیف ہے کہ ادب اُردو کے بیشتر اسالیب بیان ایک ہی عنوان کے تحت مختلف کتابوں سے تلاش کر کے مطالعہ کرنے والے کی سہولت کے لئے جمع کر دئے گئے ہیں ۔

جلال کی شاعری

تنقیدی سہولت کے خیال سے جلال کی شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کرنا پڑے گا (۱) جلال کی ابتدائی شاعری (۲) جلال کی شاعری رام پور میں (۳) جلال کی شاعری کا آخری لکھنوی دور ۔

اول جلال کی شاعری کے ابتدائی دور کا جو ماحول تھا اسے ذہن نشین کر لیجئے ۔ اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ جلال کی شاعری کا لکھنوی ماحول تلاش کرنے کے لئے ہم ان کے ہمعصروں اور ان کے اساتذہ کا جایزہ لیں ۔ جلال کے ابتدائی استاد ہلال ہیں جن کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ میر علی اوسط رشک کے شاگرد اور ان ہی کے اسکول کے نمایندے ہیں ۔ رشک کے متعلق تذکرہ نویسوں کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ تحقیق الفاظ کے دلدادہ تھے مگر ۔ بیشتر[1] حصہ ان کے کلام کا لفظی رعایتوں اور ضلع جگت کی پیچیدگیوں میں پھنسا ہوا ہے اور کہیں کہیں ایسے مبتذل مضمون باندھتے ہیں جو پڑھنے کے قابل نہیں ۔

اب جلال کے تیسرے اور آخری استاد فتح الدولہ برق کے متعلق سنئے :-

ناسخ[2] کے کلام کی طرح ان کے کلام میں بھی تکلف اور تصنع موجود ہے ۔

تذکرۂ گل رعنا ۔ تاریخ ادبیات اردو اور شعر الہند سب کے سب جلال کے ابتدائی دور میں لکھنوی شاعری کا جو رنگ تھا اس کے متعلق الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ متفق ہیں کہ :-

اس[3] زمانہ کا رنگ یہی اور تھا لفظی رعایتیں ضلع جگت کی حد تک پہونچ گئی تھیں ۔ شاعری اپنے مرتبے سے گر کر انگیا چوٹی میں پھنس گئی تھی ۔

---

[1] گل رعنا صفحہ ۳۲۸ ۔ [2] اُردو شاعری کی مختصر تاریخ صفحہ ۱۲۱ ۔ [3] گل رعنا صفحہ ۳۳۰

اس ماحول میں جلال جو کہہ سکتے تھے وہی انھوں نے کہا چنانچہ شعرالہند کا فیصلہ ہے کہ:-

"حکیم جلال[1] کے ابتدائی اور آخری کلام میں لکھنویت کا کافی حصہ موجود ہے"

یہی جلال کے ابتدائی دور یعنی قیام لکھنؤ کے زمانہ کی شاعری کے متعلق سب تذکرہ نویسوں کی رائے ہے اب ان کے دوسرے دور یعنی زمانۂ قیام رام پور کی شاعری کے متعلق سنئے اُردو شاعری کی مختصر تاریخ میں اسے واضح طور پر کہا گیا ہے۔

"جلال[2] نے پہلے لکھنوی رنگ کو قایم رکھا جب رام پور آئے تو شعرائے دہلی کے مقابلہ میں ان کو اپنی روش پسند نہ آئی اور دہلی کا رنگ اختیار کرلیا"

اسی بات کو تذکرۂ بزم سخن نے ذرا مبہم طور پر کہا ہے:-

"جلال[3] میر ضامن علی ولد حکیم اصغر علی افسانہ گو از نامی سخنوران لکھنؤ است و برق و ہلال استاد مشیر سخن بردش لکھنؤ می گفت الحال بہ طرز دہلی فکری نماید"۔

ان اقتباسات سے یہ طے ہو جاتا ہے کہ رام پور آکر جلال کا رنگِ سخن بدلا۔ اور اسے تمام ادبِ اُردو کی تاریخوں نے مانا ہے کہ نہ صرف جلال بلکہ امیر و داغ کا رنگ تغزل رام پور میں بدلا۔ اس سلسلہ میں زیادہ اقتباسات دینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ایک بات محل نظر ضرور ہے جسے تاریخ ادبِ اُردو نے یوں کہا ہے:-

"حکیم[4] صاحب اپنی تنک مزاجی اور نازک دماغی کی بدولت کئی بار ملازمت سے کنارہ کش ہوئے مگر نواب صاحب کی قدر دانیوں اور فیاضیوں نے کبھی ان کو رام پور سے قطع تعلق نہ کرنے دیا"

جلال کی نازک دماغی اور تنک مزاجی تسلیم۔ لیکن یہ نازک دماغی کیسی نازک دماغی تھی جو بار بار دربار رام پور کے مقابلہ میں شکست کھا جاتی تھی اور جلال پھر اسی کرسی کو سلام کرنے کے لئے آجاتے تھے جس کرسی کے سلام سے بیزار ہو کر وہ چلے جاتے تھے، معاملہ اگر نازک دماغی تک رہتا تو ایک بار رونما ہو کر ہمیشہ کے لئے تعلقات کا خاتمہ کر دیتا اس لئے نازک دماغی اور تنک مزاجی پر اس معاملہ کو محمول کرنا ایک قیاسی غلطی نظر آتی ہے۔ جلال کی تنخواہ رام پور میں سو روپیہ ماہوار تھی اور یہی تنخواہ ان کے سب سے بڑے حریف اور دہلی کے نمایندے داغ کو مل رہی تھی اگر کمی تنخواہ کا معاملہ تھا تو وہ بار بار اسی پر واپس کیوں آجاتے تھے یہ سب واقعات ان تمام قیاسات کو غلط ٹھہراتے ہیں جو آج تک اس معاملہ میں کئے جاتے رہے ہیں مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلال اور دربار رام پور کے درمیان کوئی اصولی اختلاف تھا اور جلال کو دربار رام پور سے سو روپیہ ماہوار پانے کے لئے دربار رام پور کے حسب منشا کوئی ایسی خدمت انجام دینا پڑتی تھی جو جلال کے اصول سے ٹکراتی تھی (آپ میرے الفاظ پر چونکیں نہیں۔ تشریح بھی حاضر ہے) جلال صرف شاعر تھے شاعر سے اصولی اختلاف اس کی شاعری سے اختلاف ہو سکتا ہے اب ایک بار وہ اقتباس دوبارہ پڑھئے جو اُردو شاعری کی مختصر تاریخ سے دیا گیا ہے یعنی "جب وہ رام پور آئے تو شعرائے دہلی کے مقابلہ میں ان کو اپنی روش پسند نہیں آئی۔ اس کے بعد شعرالہند کے یہ لفظ پڑھئے کہ "آخری کلام میں لکھنویت کا کافی حصہ موجود ہے" اور بات صاف ہو جائے گی یعنی دربار رامپور اُن سے جس قسم کی شاعری کی توقع کرتا تھا اس قسم کی شاعری کی توقع انھیں طبیعتاً ناگوار تھی۔

اگر جلال نے دہلی کے مقابلہ میں اپنے رنگ کو بے اثر اور پھیکا سمجھ کے دہلی کا رنگ اپنی پسند اور توجہ سے اختیار کیا ہوتا تو مستقل طور پر لکھنؤ جانے کے بعد یعنی آخری حصۂ عمر میں اپنی پسند سے اختیار کئے ہوئے رنگ کو کیوں چھوڑتے اور ناپسند کر کے چھوڑے ہوئے رنگ کو دوبارہ اختیار کیوں کرتے جلال کے آخری حصۂ کلام میں لکھنویت کا جو کافی حصہ مولفِ گلِ رعنا کے قول کے بموجب موجود ہے وہ خود بخود تو نہیں آگیا ہے اسے جلال نے ہی کہا ہے اسی جلال نے جو اپنے رنگ کو بے اثر دیکھ کر اسے اپنی پسند سے چھوڑ چکا تھا یہ ایک معمہ ہے یا نہیں اور اس معمہ کا واحد حل یہی ہے کہ آخر عمر میں جلال پر

---

[1] شعرالہند صفحہ ۳۵۰ - [2] اُردو ادب کی مختصر تاریخ صفحہ ۱۶۸ - [3] تذکرہ بزم سخن صفحہ ۳۶ - [4] تاریخ ادبِ اُردو صفحہ ۴۴۱

دربار رام پور میں حاضری کی پابندی نہیں رہی تھی یعنی ان کی شاعری دربار رام پور کے اثرات سے باہر ہوگئی تھی اور اپنے کلام پر دربار رام پور کی کوئی اخلاقی پابندی یا ناپسندی کا خوف نہ پاکر وہ دوبارہ اسی رنگ کی طرف متوجہ ہوگئے جو انھیں فطرتاً پسند تھا اس معمہ کا حل اس قیاس کے علاوہ کہیں اور ملنا غیر ممکن ہے۔ وہ دیکھتے تھے کہ امیر نے بھی اپنے طرز ادا میں تبدیلی کرلی ہے وہ دیکھتے تھے کہ داغ کا رنگ بھی نمایاں طور پر تبدیل ہوا ہے وہ محسوس کرتے تھے کہ میں بھی دربار پسند اور رام پور کے عوام میں مقبول ہونے کے لئے عام پسند شعر کہنے پر مجبور ہوں جب ان کی لکھنویت دربار کی اس خواہش سے زور شور کے ساتھ ٹکراجاتی تھی وہ ان الجھنوں کو توڑ پھوڑ کے نکل بھاگتے تھے لیکن دربار رام پور اس رنگ کو رواج دینا چاہتا تھا اور اسے یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ داغ اور امیر سے زیادہ جلال میں اس رنگ کو روانی کے ساتھ کہنے کی صلاحیت موجود ہے۔ لہذا دربار شاہی منصب حکمرانی۔ مزاج رئیسانہ بلکہ فطرت حاکمانہ ہر چیز جلال کے لئے موقع ملتے ہی اپنے اندر نرمی اور لوچ پیدا کرلیتی تھی۔ کیا تاریخ ادب اردو کے ان الفاظ کی کہ نواب صاحب کی قدردانیوں اور "فیاضیوں" کی اس سے بہتر کوئی تشریح ہوسکتی ہے اگر ہے تو مجھے بتایئے آخر دربار رام پور سے بے تعلق حاضری وظیفہ پانے کے بعد وہ دوبارہ اپنے قدیم رنگ کی طرف کیوں رجوع ہوئے اور اپنے قدیم رنگ پر اُن کا خاتمہ کیوں ہوا۔

رام پور میں جلال نے جو مشاعرے پڑھے یا داغ، امیر اور جلال کے دیوانوں میں جو ہم طرح غزلیں موجود ہیں ان میں ایک ہی قافیے کے شعروں کا مطالعہ بھی لطف سے خالی نہیں مثلاً :-

داغ : ہنسا ہنسا کے شبِ وصل اشکبار کیا — تسلیاں مجھے دے دے کے بیقرار کیا
جلال : ستم سے لطف نے کچھ بڑھ کے دل فگار کیا — تسلیوں نے تری اور بیقرار کیا
داغ : اے حنا تیرے تلون سے مجھے حیرت ہے — سبز سے سرخ ہوا رنگ ترا بوند ہوا
جلال : باغباں لاکھ چھپایا کئے لیکن نہ چھپا — خونِ مرغانِ چمن رنگ ہوا بو ند ہوا
داغ : رگ رگ میں چھپاتا ہوں ترا دردِ محبت — پھر بھی تو یہ کم بخت نہاں ہو نہیں سکتا
امیر : دہراؤ کہ ٹھہراؤ تم آگے سے دوپٹہ — ابھرا ہوا جوبن تو نہاں ہو نہیں سکتا
جلال : تم لاکھ چھپو ہم سے مگر چھپ نہیں سکتے — جو دل میں ہے آنکھوں سے نہاں ہو نہیں سکتا
داغ : کیا ہم نے عذابِ شبِ ہجراں نہیں دیکھا — تم کو نہ یقین آئے تو ہاں ہاں نہیں دیکھا
امیر : کیا شوق ہے دکھلا کے جو رخ پوچھیں وہ مجھ سے — اب بھی نہیں دیکھا تو کہوں۔ ہاں نہیں دیکھا
جلال : دل ہی نہیں کہتا۔ رخِ جاناں نہیں دیکھا — آنکھوں میں بھی تکرا رہی۔ ہاں ہاں نہیں دیکھا
داغ : یہ دل تو وہ ہے کہ اس سے میں دردمند ہوا — یہ کیا پسند کیا۔ تم کو کیا پسند ہوا
" : وفا نہیں نہ سہی۔ شیوۂ جفا ہی سہی — پسند آپ کی جو آپ کو پسند ہوا
امیر : کیا قبول نہ گل نے مرے گریباں کو — کبھی نہ خار کو دامن مرا پسند ہوا
" : نہ پوچھ الفتِ خالِ سیاہ کا باعث — پسند اپنی ہے مجھ کو یہی پسند ہوا
جلال : دل اک حسین کا جب سے نیازمند ہوا — ستم نصیب۔ جفاکش۔ بلا پسند ہوا
" : دیا ہے ہم نے دل اپنا بصد نیاز جسے — یہی وہ ناز سے کہدے کہ ناپسند ہوا +
داغ : آپ کیوں خاک میں ملاتے ہیں، — ہم مصیبت طلب ملیں گے آپ
جلال : بے خودوں کو تلاش سے کیا کام — ہر جگہ بے طلب ملیں گے آپ
داغ : سو گھروندہ پھرا کرتے ہیں اس گھر سے نکل کر — کیا پاؤں نکالے دلِ مضطر سے نکل کر
جلال : تم انجمن آرا ہو کبھی گھر سے نکل کر — آ بیٹھو بغل میں دلِ مضطر سے نکل کر

داغ : داغ پھر تانک جھانک کرتے ہیں — اب پھنسے اب گرے کہیں نہ کہیں
امیر : مسکرا کر وہ شوخ کہتا ہے، — آج بجلی گری کہیں نہ کہیں،
جلال : اُف نہ کرنا کہ تیری چپ کی جلال — داد مل جائے گی کہیں نہ کہیں،
داغ : اب یہی ضد ہے کہ ہم قتل کریں گے تجھ کو — وہ تو ہر بات میں اپنا ہی کہا کرتے ہیں
جلال : خوش نصیب اس سے زیادہ کوئی دنیا میں نہیں — پیار سے جس کو وہ کمبخت کہا کرتے ہیں +
داغ : بتانِ ماہ وش اُجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں — کہ جسکی جان جاتی ہے اُسی کے دل میں رہتے ہیں
جلال : بہت بے چین میری خاطرِ بسمل میں رہتے ہیں — کسی سے پوچھ لینا تھا انھیں کس دل میں رہتے ہیں
داغ : نظر کھائے جاتی ہے عشاق کی، — حسینوں کو دنیا میں راحت نہیں
جلال : خدا رنج دینے کی توفیق دے — میں تم سے طلبگار راحت نہیں
داغ : گردشِ چشم بلا۔ شوخیِ رفتار غضب — ایسے چلتے ہوئے فتنے اسی عالم میں ہے
امیر : دو جہاں چھوڑ کے عشاق ترے غم میں ہے — دونوں عالم سے جدا تیسرے عالم میں ہے
جلال : دیکھنا پیرِ مغاں کی نظرِ لطف کا فیض — عمر بھر رند جوانی ہی کے عالم میں رہے
داغ : روبرو اس بدگماں کے ذکرِ عشق — میرے آگے آئی نادانی مری،
جلال : سنگِ در اس کا ہے پیشانی مری — اب نہ سر پھوڑوں تو نادانی مری
داغ : اطاعت میں اغیار خامی کریں گے — ہمیں بندہ پرور غلامی کریں گے
جلال : بکا کوئی یوسف تو خود مول لے کر — محبت کے بندے غلامی کریں گے
داغ : شکوۂ آزردگی میں گر کہا تو یہ کہا — کیا غرض کیا واسطہ ہم کیوں خفا ہونے لگے
جلال : پھر ہم ان کے روٹھ جانے پر فدا ہونے لگے — پھر ہمیں پیار آگیا۔ جب وہ خفا ہونے لگے +
داغ : بڑا مزا ہو جو محشر میں ہم کریں شکوا — وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کے لئے
امیر : مجاز میں بھی ہے اپنی نظر حقیقت پر — بتوں کی راہ میں پڑتے ہیں ہم خدا کے لئے
جلال : کسی صنم کا وہ کہنا ادائے وصل کی رات — نہ بولو ہم سے نہ چھیڑو ہمیں خدا کے لئے + [1]
داغ : قتل ہوں گے ترے ہاتھوں سے خوشی اسکی ہے — آج اترائے ہوئے پھرتے ہیں مرنے والے
〃 : حشر میں لطف ہو جب اُن سے ہوں دو دو باتیں — وہ کہیں کون ہو تم۔ ہم کہیں مرنے والے
〃 : عمر بھر حسنِ خدا داد رہا کرتا ہے، — دو گھڑی بعد بگڑتے ہیں سنورنے والے
امیر : بزمِ ماتم میں کبھی شب ہی کو آجا چھپ کر — او مرے سوگ کے پردے میں سنورنے والے
〃 : جان دینے کو کہا اُن سے تو ہنس کر بولے — تم سلامت رہو ہر روز کے مرنے والے
جلال : گو ترے ناز ہیں سب زندہ ہی کرنے والے — ڈھونڈھ لیتے ہیں بہانہ کوئی مرنے والے
〃 : کھول کر بال پریشان نہ کر روح کو تو — او مرے سوگ کے پردے میں سنورنے والے

+ [1] جلال کے جن اشعار پر میں نے چوپارے بنا دئے ہیں وہ میاں نظام شاہ رام پوری کے شعروں سے کس قدر مماثل ہیں اس کا فیصلہ میں ارباب ذوق پر چھوڑتا ہوں۔

داغ : قیامت ہے بانکی ادائیں تمھاری اِدھر آؤ لیلوں بلائیں تمھاری
جلال : تصور میں ہیں کچھ ادائیں تمھاری ابھی لے رہے تھے بلائیں تمھاری

یہ تقابل بڑا مشکل ہے چار دیوان جلال کے - چار دیوان داغ کے - دو دیوان امیر کے - ان سب میں صرف ہم طرح غزلیں اور ایک ہی قافیہ اس تلاش میں بیشتر یہ ہوا کہ تینوں استادوں میں سے کسی ایک نے کوئی قافیہ بہترین طور پر نظم کر دیا تو دوسرے کے ہاں وہ قافیہ ہی سرے سے غائب بیشتر یہ محسوس ہو کہ ہم طرح غزلیں تو موجود ہیں لیکن کسی نے ایک قافیہ اچھا کہا ہے تو کسی نے دوسرا قافیہ اور اکثر یہ بھی ہوا - کہ ہم قافیہ اشعار میں یہ اساتذہ ایسے شعر کہہ گئے جنھیں نقل کرنا میرے قلم نے غیر ضروری سا سمجھا - بہرحال دو چار دن کی جستجو اور تلاش میں جو کچھ مجھ سے ہو سکا حاضر ہے - افسوس اس کا ہے کہ جلال نے ان نغموں کو غالب کی طرح "بے رنگ من است" سے زیادہ وقعت نہیں دی اور جیسا کہ اُردو کے بیشتر تذکرہ نویسوں کی رائے ہے ان پھولوں کو ہر طرف سے کچھ اس قسم کے کانٹوں سے ڈھانپ دیا ہے

شہرہ ہے "گنجفہ بازی" کا تری دہر دو رنگ کون سا فرد بشر ہے جسے "چکما" نہ دیا
دیکھے جو آئینہ بھی شباب اس جمیل کا دل میں چبھے اُبھار مہاسوں کی کیل کا
"توڑیں گے" یوں کہ پھر نہ ملے غیر سے وہ شوخ جس روز کوئی "جوڑ" ہمارا بھی چل گیا
ادنیٰ سا کرم دیدۂ تر کا ہے یہ ہم پر بادل کا ہے ٹکڑا نہیں رومال ہمارا
قلزم عشق نے قاصد کا نہ ممنون کیا یار تک پہونچے عریضے مرے دریا دریا
سونگھا ہوا ہے گیسوؤں میں جو چنبیلی ہے یہ بھی کہو تمھارے تلوں میں بھی تیل ہے

میں نے جلال کے اس قسم کے اشعار نقل کرنے میں بھی احتیاط اور متانت کو زیادہ مدِ نظر رکھا ہے ورنہ اس قسم کے اشعار میں بیشتر شعر ایسے ہیں جو آج کے مشاعروں میں "ہُدہُد" جیسے شاعر پڑھ سکتے ہیں اور مجھے افسوس ہے کہ میں "مہاسوں کی کیل" اور "تمھارے تلوں میں بھی تیل ہے" کو نقل کرنے پر اس لئے مجبور ہوا کہ مجھے جلال کے لکھنوی رنگ کے بڑھتے اور گھٹتے یا اونچے اور نیچے دونوں قسم کے نمونے پیش ہی کرنا تھے - جلال کے ابتدائی دور اور آخری دور کے کلام کا تقریباً یہی حال ہے "ان تے آور" شعروں کو نقل کر دینے کے گناہ کی تلافی یہی ہو سکتی ہے کہ میں آپ کو جلال کے دو چار شعر ایسے سنا دوں کہ وہ اسی قسم کے شعر کہتے رہتے تو ادبِ اُردو کی ٹکسال میں بڑا مال ہوتے بہت بڑا مال ہے

نہ خوفِ آہ بتوں کو نہ ڈر ہے نالوں کا بڑا کلیجہ ہے ان دل دُکھانے والوں کا
ہمیں پہ آفتِ صرصر چمن میں آیا کی وہی درخت گرا جس پر آشیانہ ہوا
کیا اُلفت نے جس کی ہم کو برباد الٰہی تو اسے آباد رکھنا
خدا رنج دینے کی توفیق دے میں تم سے طلبگارِ راحت نہیں
مبتلائے غمِ حبیب رہے ہم محبت میں خوش نصیب رہے
سوچ کر رنج دیجئے مجھ کو اس میں پہلو ہیں میری راحت کے
خوابِ غفلت ہی ہے بہتر کہ ہم آغوش ہے یار آنکھ کھلنے پہ یہ سامان رہے یا نہ رہے

درحقیقت بات وہی ہے کہ جلال نے فردوسِ مکاں نواب یوسف علی خاں اعظم اور خلد آشیاں نواب کلب علی خاں نواب کی پسند اور رام پور کے مشاعروں کے ماحول کا پاس کیا اور جب وہ ان اثرات سے آزاد ہو گئے تو انھوں نے اپنے قدیم رنگ کی طرف رجوع کر لیا - لیکن جلال کا یہ رجوع "کَمَا لَا یَنْبَغِیْ لَہٗ" کا درجہ نہ پا سکا بلکہ بالکل بے کار ثابت ہوا کیونکہ اس نے لکھنؤ کے متروک اور بے اثر طرزِ سخن کو دوبارہ زندہ کرنے میں کوئی امداد نہیں کی اور تیس چالیس برس سے جو شوخ اور ہلکا پھلکا تغزل خود امیر، داغ اور جلال کے ذریعہ سے پورے ملک میں پھیل چکا تھا

اس کے اثر کو مٹا دینا نہ دہلی کے قدیم رنگ کے بس کی بات رہ گئی تھی نہ لکھنؤ کے قدیم رنگ کے۔

اتنا تو مجبوراً ہر تذکرہ نویس نے مانا ہے کہ نواب فردوس مکاں اور نواب خلد آشیاں کے عہد میں رام پور سے ایک ایسے رنگِ تغزل کی بنیاد پڑی جسے جلال، امیر اور داغ نے اختیار کیا اور جو متاخرین کے دورِ آخر میں امیر، داغ اور جلال کے تلامذہ کے ذریعہ تمام ہندوستان میں پھیل گیا لیکن اسے وہ دہلی اور لکھنؤ کے شعراء کے ملاپ کا نتیجہ بتاتے ہیں، صرف تاریخ ادبِ اردو نے اس مسئلہ میں ابتداءً اتنا کہا ہے کہ:-

"یہ اردو شاعری کا ایک ایسا اہم اور غور طلب مسئلہ ہے جس کی طرف کافی توجہ ابھی منعطف نہیں ہوئی ہے۔" (صفحہ ۱۴۱)

لیکن وہ دن قریب ہے جب یہ ماننا پڑے گا کہ یہ رنگ تغزل صرف دہلی اور لکھنؤ کے شعراء کی یکجائی سے نہیں پیدا ہوا تھا بلکہ فرمانروایانِ رام پور کے دو اونچے درجے کے شاعر رسا اور نظام تھے اور جسے دربار رام پور کی داد و دہش نے پھیلایا۔

(**نگار**) جناب رازؔ نے یہ مضمون جس لب و لہجہ میں لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جلالؔ سے کچھ خوش نہیں ہیں اور اسی لئے انھوں نے ان کے سوانح لکھنے میں بھی صرف "خدا کرے" پر عمل کیا۔ ہو سکتا ہے کہ جلالؔ کی زندگی کا کوئی روشن رُخ ان کے سامنے نہ آیا ہو، لیکن جلالؔ کی شاعری کے متعلق ان کا یہ ارشاد کہ ان کا اچھا کلام صرف اسی زمانہ کا ہے جب وہ رام پور میں تھے اور اس سے قبل و بعد انھوں نے جو کچھ کہا وہ یکسر لکھنوی تصنع تھا، ضرور غور طلب ہے۔ ابتدائی شاعری کے متعلق تو یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے، کیونکہ اس وقت لکھنوی شاعری کا رنگ ہی ایسا تھا ——— اسی طرح ان کی شاعری کے درمیانی دور کی بابت یہ کہنا کہ وہ رام پور کی فضا سے کافی متاثر ہوئی بالکل غلط نہیں ہو سکتا، حالانکہ امیرؔ و داغؔ نے اس زمانہ میں رامپور رہ کر جو کچھ کہا وہ جلالؔ کے کلام سے بہتر نہ تھا، لیکن ان کے آخری دور کے بابت یہ کہنا کہ وہ بھی ابتدائی دور کی طرح ابتذال اور تکلف و آورد کے سوا کچھ نہ تھا، البتہ محلِ نظر ہے۔ جلالؔ نے اپنے بعد کئی دیوان چھوڑے ہیں اور یقین کے ساتھ نہیں کہا جاتا کہ ان کی سیکڑوں غزلوں میں کون سی غزلیں آخری عہد کی ہیں اور کون کون سی ابتدائی یا درمیانی عہد کی، تاہم اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان کے یہاں لکھنوی رنگ ضرور پایا جاتا تھا اور پایا جانا چاہئے تھا، کیونکہ شعر و شاعری میں جس سلسلہ سے وہ وابستہ تھے، وہ لکھنؤ کا سب سے بڑا نمایندہ انھیں "طامات و سطحیات" کا تھا۔ لیکن یہ کہنا کہ جلالؔ، امیرؔ و داغؔ کے مقابلہ میں کمتر درجہ کے شاعر تھے، البتہ میری سمجھ میں نہیں آیا، اگر تغزل کے اس بلند معیار کو سامنے رکھا جائے جو شعراء دہلی نے قایم کیا تھا تو پھر جلالؔ کیا امیرؔ و داغؔ کا ذکر بھی کوئی معنی نہیں رکھتا، لیکن اگر نشاطیہ و جنسیاتی تغزل کو بھی شاعری قرار دیا جائے جس کا سب سے بڑا علمبردار داغؔ کو سمجھا جاتا ہے تو میں اس حیثیت سے کہ جلالؔ نے اس میں معنویت بھی پیدا کی، جلالؔ کو داغؔ پر بھی ترجیح دوں گا — امیرؔ کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے کیونکہ وہ غریب تو نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے "مرأۃ الغیب" تک تو خیر غنیمت تھا کہ وہ ان کی خاندانی شاعری تھی، بُری ہو یا اچھی مگر اپنا ایک مستقل رنگ رکھتی تھی، لیکن داغؔ کے بازاری رنگ کی مقبولیت دیکھ کر (جو رام پور ہی سے شروع ہوتی ہے) جب انھوں نے "صنم خانۂ عشق" لکھا تو وہ شاعر نہ رہے بلکہ خالص نقال ہو کر رہ گئے اور نقال بھی بہت بُرے کیونکہ ان کو اس نقالی میں داغؔ کا وہی رنگ پسند آیا جو داغؔ کے لئے بھی باعث ننگ تھا اور اُس "شاہد پرستانہ" رنگ سے دامن کشاں گزر گئے جو کبھی کبھی واقعی دامنِ دل کھینچ لیتا ہے اور ایسا ہونا تعجب کی بات نہ تھی، کیونکہ امیرؔ جیسا صاحب فضل و کمال اور پاکیزہ خصایل درویشی رکھنے والا انسان جب "تاش بینی" کرے گا تو ایسی ہی ٹھوکریں کھائے گا۔

میں امیرؔ کی انسانی عظمت کا بڑا معترف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ جس حد تک خصایل کی برگزیدگی، اخلاق کی بلندی اور علمی فضل و کمال کا تعلق ہے، داغؔ و جلالؔ ان کی خاکِ پا کو بھی نہیں پہونچ سکتے تھے، لیکن ان کی شاعری یقیناً "بہ مدرسہ کہ بُرد"

والی شاعری تھی اور آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ "گوہر انتخاب اور جوہر انتخاب" انھیں کا ہے یا کسی اور کا اور اگر انھیں کا ہے تو پھر میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ دنیائے شاعری میں ان سے بڑا مرتد کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا۔

میں ابھی ابھی ظاہر کر چکا ہوں کہ شاید پرستانہ شاعری میں جلال کو میں امیر و داغ سے بھی بہتر سمجھتا ہوں۔ امیر پر ان کی ترجیح کا سبب تو میں بتا چکا جس سے انکار کرنا امیر کی انسانی عظمت سے انکار کرنا ہے، لیکن داغ کے مقابلہ میں جلال کو ترجیح دینا البتہ کسی قدر صراحت چاہتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ داغ اور جلال دونوں کا معشوق ایک ہی سا ہے، وہی تختۂ بازار والا معشوق جس تک ہر ایک کی رسائی ہو سکتی ہے، جہاں نگاہِ شوق سے پہلے عاشق اپنے جسم کو پہونچانا چاہتا ہے، جس کے حاصل کرنے میں بڑی سخت مسابقت (Competition) درکار ہوتی ہے اور جہاں وہی زیادہ کامیاب ہوتا ہے جو سب سے زیادہ طرحدار نہیں بلکہ زیادہ باتیں بنانے والا ہو، علم مجلس جانتا ہو اور جو اپنی باتوں سے دلوں میں گدگدی پیدا کر سکتا ہو۔

ان خصوصیات کے پیش نظر جب آپ داغ و جلال کی قسمت کا موازنہ کریں گے تو بڑا فرق نظر آئے گا، داغ کی زندگی شروع سے اخیر تک اسی ماحول میں گزری جہاں عورت سے محبت نہ کی جاتی تھی بلکہ اس کا سودا ہوتا تھا، روپیہ سے، جھوٹی تعریف سے، جنسیاتی ولولہ اور اعصابی ہیجان سے۔ داغ کے شباب نے اپنی سب سے پہلی انگڑائی لی، قلعۂ معلیٰ کی لگاوٹ کرنے والی کنیزوں اور خواصوں کے جھرمٹ میں اس کے بعد جب وہ زیادہ جوان ہوئے تو خوش قسمتی سے رامپور پہونچے جہاں کی فضا اور زیادہ جوان تھی اور جہاں کی محافل عیش و نشاط پر بھی عورت ہی چھائی ہوئی تھی، پھر جب اخیر میں حیدر آباد گئے تو اس ذوق میں اور چار چاند لگ گئے، کیونکہ اب عورتوں کا التفات خریدنے کی بھی استطاعت انھیں نصیب ہو گئی تھی اور اس میں شک نہیں کہ اس سے انھوں نے پورا فایدہ اٹھایا اور خوب خوب حق پیر افشانی ادا کیا۔

غالب ساری عمر میں صرف ایک "ڈومنی کو مار رکھنے" کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکے، مومن کو کسی پردہ نشین خاتون سے عشق ہوا اور اخیر وقت تک اپنی ناکامی کا ماتم کرتے رہے، جرأت کی محبوبہ نے ہمیشہ انھیں دھوکا دیا اور وہ اس کا کچھ نہ کر سکے۔ لیکن داغ!۔ نے یہ جھول کبھی نہیں پالا وہاں تو "روز معشوق نیا، روز ملاقات نئی" والا معاملہ تھا، اور ان کا مسلک صرف یہ کہ:۔

اک نہ اک ہم لگائے رکھتے ہیں

پھر اس "لگائے رکھنے" میں انھیں کیا کیا کرنا اور کیا کیا کہنا پڑا ہوگا اس کا سمجھنا آسان نہیں — عیاشانہ زندگی اختیار کرنا آسان بات نہیں۔ یہ بڑا سلیقہ، بڑا دم خم اور بڑا عیارانہ دماغ چاہتی ہے، اس کے لئے پینتروں کی ضرورت ہے اور داغ ان تمام پینتروں سے واقف تھے۔ انھوں نے عیاشی کی فن کی طرح اور فن ہی کی طرح اس کو ظاہر بھی کیا۔

طعن و تشنیع، ہزل و استہزاء، جلی کٹی، حسرت و یاس، نفرت و بیزاری، چھیڑ چھاڑ، غصہ و برہمی اور اسی کے ساتھ جوڑ توڑ، پینترے، تیور، کاٹ چھانٹ، الغرض بہت سی ایسی ہی باتیں جن سے اس کوچہ میں کام لیا جاتا ہے، ان سب کا داغ کو پورا تجربہ تھا اور ان سب کا اظہار وہ "کار آگہانہ" طریقہ سے کرتے تھے اور پوری سچائی کے ساتھ۔

وہ بڑا کھل کھیلنے والا شاعر تھا، جو کہنا تھا دو ٹوک کہتا تھا، آن بان سے کہتا تھا اور کھلی ہوئی آغوش اور پوری طرح بکھر جانے والے جوش کے ساتھ کہتا تھا:۔

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

لفظ اُف نے جو "چلچپا ہٹ" اس شعر میں پیدا کر دی ہے، اس کی مثال آپ کو داغ ہی کے کلام میں ملے تو ملے اور

کہیں نہیں مل سکتی۔ حکایت لذیذ تھی "دراز تر" ہوگئی۔ بہرحال مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ داغ کی جنسیاتی شاعری، ان کی عملی زندگی کی بھی داستان تھی اور ان کے یہاں اس کی تمام تجربیاتی خصوصیات بھی بہت صاف صاف نظر آتی ہیں، لیکن جلال کے "طالعِ ناساز" کو کبھی ان تجربات کا موقع نصیب نہیں ہوا۔ اس غریب سید نے عشق بھی کیا ہوگا تو نہایت عاجزانہ وغریبانہ۔ داغ کے سے چونچلے وہ کہاں سے لاتا، دوسروں کی دیکھا دیکھی اگر اس نے بھی کچھ ایسی ہی باتیں کہدی ہوں تو ظاہر ہے کہ ان میں کیا خاک مزہ آسکتا ہے۔

داغ نے جو کچھ کہا وہ کوٹھے پر پہونچ کر کہا، عورت کا زانو دبا کر کہا، اور غریب جلال کو شاید کبھی نگاہ بھر کر دیکھنے کا بھی موقع نہ ملا ہوگا۔ اس لئے جس حد تک معاملات کا تعلق ہے، یقیناً داغ کی شاعری کو کامیاب ہونا چاہئے اور اس خصوص میں جلال کیا کوئی شاعر بھی داغ کا حریف نہیں، لیکن "محبت ناکام" سے جو جذبات پیدا ہوسکتے ہیں، خواہ وہ محبتِ جنسی ہی کیوں نہ ہو، وہ ہمیں جلال کے یہاں زیادہ نظر آتے ہیں اور اسی لئے ان کے یہاں جو کسک یا مجبورانہ کیفیت صبر وضبط کی پائی جاتی ہے، وہ داغ کے یہاں مفقود ہے۔

جلال بدقسمتی سے لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور یہیں کی پُرتصنع فضا میں ان کی شاعری پروان چڑھی، لیکن ان کا فطری ذوق یہ نہ تھا، جس کا اظہار خود انھوں نے اس طرح کیا ہے:۔

صاف کہتا ہوں اگر پوچھتے ہو مجھ سے جلال — شاعری نام ہے جس کا وہ فقط میر نے کی

کہنے کو جلال آپ بھی کہتے ہیں وہی طرز — لیکن سخنِ میر تقی میر کی کیا بات،

داغ کے یہاں آپ کو اس حقیقت کا اعتراف کہیں نظر نہ آئے گا۔

پھر یہ تو صحیح ہے کہ جلال نے میر کی سی شاعری نہیں کی۔ پھر ایک جلال کیا کسی اور ہی کو کب یہ سعادت نصیب ہوئی۔ لیکن ان کا یہ ذوق انھیں مومن کے حدود تک ضرور لے گیا۔ اور ایک ہلکی ہلکی کسک، ایک میٹھا میٹھا درد جو جنسیاتی محبت میں بھی پایا جاسکتا ہے۔ جلال کے کلام میں بھی پیدا ہوگیا، جس کو جناب رازؔ نے بالکل نظر انداز کیا اور میں اسی چیز کو جلال کا اصل فن قرار دیتا ہوں۔

جلال کی افتادِ طبع اور حالاتِ زندگی اس کو داغ تو بنا سکے، لیکن "بوئے داغ" ضرور اس کے کلام میں چھوڑ گئے جس سے داغ کا کلام یقیناً محروم تھا۔

اب رہا مسئلہ زبان اور لب ولہجہ کا، سو اس میں میرے نزدیک دونوں ایک سا درجہ رکھتے تھے، فرق صرف یہ تھا کہ داغ کی زبان محض فطری زبان تھی اور جلال کی فطری واکتسابی دونوں۔ وہاں سند ہی سند تھی اور یہاں سند کے ساتھ دلیل بھی۔

میں جلال کے جس رنگ کا معترف ہوں اور جسکی بنا پر میں انھیں لکھنؤ کا بڑا خوشگو شاعر کہتا ہوں، اس کی مثالیں دینے میں جناب رازؔ نے بہت بخل سے کام لیا، اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر میں اس کمی کو پورا کردوں:۔

حشر میں کہتے پھرے ہم جلوہ اس کا دیکھ کر — حوصلہ یاں بھی نہ نکلا شوقِ خاطر خواہ کا

یاد رہ جائے گی فرقت کی یہ مجبوری بھی — دم نہ ہم توڑ سکے موت پہ قابو نہ ہوا

تغافل کے گلے سن کر جھکا لیں تم نے کیوں آنکھیں — مرے شرمندہ کرنے کو ذرا بیباک ہونا تھا

آپ کو بھول گئے دیکھ کے اس بت کو جلال — حق ادا ہو نہ سکا پھر بھی ثنا سائی کا

اگرچہ ایک بھی تسکین کا جواب نہ تھا — مگر کچھ آتے ہی قاصد کے اضطراب نہ تھا

کسے خبر جو ہوئیں مجھ میں یار میں باتیں، — یہاں خطاب نہ تھا کچھ وہاں جواب نہ تھا

گلہ ہے ہم سے کہ تم ضبطِ گریہ کر نہ سکے ہنسی جب آگئی اُن کو کب اختیار رہا

گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلفِ یار کی بو پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا

کب آئے گا کوئی مجھ تک جواب دیتا جا تسلیاں بھی تو اے اضطراب دیتا جا

مری داستانِ فراق نے شبِ وصل طرفہ مزا دیا کبھی میں نے رو کے ہنسا دیا کبھی اُس نے ہنس کے رُلا دیا

بعد مدت کے خیالِ دلِ ناشاد آیا آج بھولا ہوا اک دوست ہمیں یاد آیا

نہ خوفِ آہ بتوں کو نہ ڈر ہے نالوں کا بڑا کلیجہ ہے ان دل دُکھانے والوں کا

ہم تھوڑے سے بھی جرم پہ شرمائے ہیں کیا کیا اک جرعۂ مے پی کے عرق آئے ہیں کیا کیا

پہونچے نہ وہاں تک یہ دعا مانگ رہا ہوں قاصد کو اُدھر بھیج کے دھیان آئے ہیں کیا کیا

سلوکِ عشق نا انصاف یہ معلوم تھا کس کو اُسے بیرحم کر دے گا ہمیں بے صبر کر دے گا

انھیں سے پوچھئے دیکھا ہے جو کچھ آنکھوں نے ہمیں خبر نہیں کیا روزِ انتظار ہوا

آہ کھینچا چاہتا تھا ضبط نے روکا مجھے سینۂ سوزاں میں اک شعلہ بھڑک کر رہ گیا

کارواں سے ضعف نے مجھ کو چھڑایا اے جلالؔ نقشِ پائے رفتگاں پر سر ٹپک کر رہ گیا

کلیم طور پہ تم نے کہو تو کیا دیکھا جلالؔ تھا کہ فروغِ جمال تھا کیا تھا

جمالِ یار بھلا کوئی دیکھ سکتا ہے یہ کس خیال میں تو اے جلالؔ تھا کیا تھا

میں اک جھلک سے ہوں گا بیخود وہ کلیم تھے میں اک جھلک سے خاک نہ ہونگا وہ طور تھا

ایذا وہ کوئے یار میں رہ کر اُٹھائی ہے اب ذکر سن کے کانپتے ہیں ہم بہشت کا

عاشق کو جلالؔ آپ وہ فرما گئے ناشاد اس پر بھی تو کمبخت کو شاداں نہیں دیکھا

دل سے تنگ آئے ہیں ہم جوشِ جنوں کا کیسا یوں گریباں نہیں کیا پھاڑتے سودا کیسا

اپنا ہاتھ اپنی چھُری اپنا گلا ہے اِک دن خنجر و بازو و قاتل کا بھروسا کیسا

میں شوقِ دید میں کیا جانے کتنی دور آیا کھلی کچھ آنکھ وہیں جب قریبِ طور آیا

تسلیاں جو وہ یونہیں دیا کریں گے جلالؔ تو صبر پھر دلِ بیتاب کو ضرور آیا

یاد آگئیں کچھ اور جلالؔ اس کو جفائیں بھولے سے بھی اظہار نہ کرنا تھا وفا کا

کہہ کے وہ اُٹھ گئے کہ مشکل ہے سہل کرنا تمھاری مشکل کا

دل ہمارا اور یوں ہو جائے ہم سے منحرف آج ان کی کج ادائی کا گلہ جاتا رہا

کیوں کسی کی جستجو کو دل مچلتا، کھوئے جانے کے سوا کیا مل گیا

ہائے قاتل نے ہمیں کو نہ کیا قتل جلالؔ جرمِ آخر وہی ٹھہرا جو گنہگار نہ تھا

اشکِ حسرت جو گر پڑا ہے تمھارے آگے ابھی ٹپک کر اسی نے آنکھوں میں صبح کر دیں بہت سی راتیں کھٹک کھٹک کر

دم بھر کو ترے وعظ میں ہم بیٹھ کے واعظ برسوں نہ رہے بزمِ خرابات کے قابل

دعائے بد بھی تو کرتے نہیں مرے حق میں کچھ ایسے بیٹھ رہے مجھ سے ہاتھ اُٹھا کے تم

کہو تو دور سے دیکھیں نہ دیکھیں پاس سے ہم نظارہ کرلیں کوئی دم نگاہ یاس سے ہم

کچھ ان کو بھی ہے ہمارا خیال، پوچھتے ہیں کبھی گمان سے اپنے کبھی قیاس سے ہم

جلال دل کی تڑپ یوں ہی دور ہو شاید
اُٹھائے دیتے ہیں لو اُن کو اپنے پاس سے ہم

جو دل نہ ہوگا نہ ہوا اس کا مجھ کو غم بھی نہیں
سنا رہی ہے تری آرزو کہ ہم بھی نہیں

چٹکیاں بیٹھ کے لیتے ہیں مرے پہلو میں
اور دُکھتے ہوئے دل کو وہ دُکھا جاتے ہیں

سیکڑوں بار اُنھیں ہم نے پنہائے ہونگے
کیا اگر قبر پہ دو پھول چڑھا جاتے ہیں

کس کی محشر میں ہم کریں فریاد
داورِ حشر ہو تمھیں نہ کہیں

باز آئے کہ نہ آئے وہ جفاؤں سے جلال
تم تو کر گزرو جو کچھ اہلِ وفا کرتے ہیں

حشر میں چھپ نہ سکا حسرتِ دیدار کا راز
آنکھ کمبخت سے پہچان گئے، تم مجھ کو

کہدیں تم سے کون ہیں کیا ہیں کہاں رہتے ہیں ہم
بیخودوں کو اپنے جب تم ہوش میں آنے بھی دو

کمی کس کی طرف سے پائی جاتی ہے محبت میں
ہم اپنے دل سے پوچھیں آپ اپنی کم نگاہی سے

نجات ہوگئی ناصح سے عمر بھر کے لئے
اُسی کو بھیجدیا یار کی خبر کے لئے

دعوے کرتے تو ہو وفا کے جلال
دیکھو وہ شوخ بے وفا نہ سنے

کہہ کے جھوٹے ہوئے کچھ بات بنائی نہ گئی
دل کی چوٹ اُن کو کسی طرح دکھائی نہ گئی

تمھاری بزم میں ہم خود نہ سنبھل جاتے یہ مشکل تھا
وہ دل کیا ہوگیا رہ رہ کے جسکو تھام لیتے تھے

پھر ہم اُن کے روٹھ جانے پر فدا ہونے لگے
پھر ہمیں پیار آگیا جب وہ خفا ہونے لگے

چلا ہوں لے کے میں فریاد انکی وہ میری
اب اس میں دیکھئے پہلے خدا سنے کس کی

آپ کمبخت جنھیں کہہ کے پکاریں سر بزم
بخت اُن کا ہے نصیب اُنکے ہیں قسمت اُنکی

آج آپ کی فرقت کی بسر رات نہ ہوگی
مل لیجئے پھر ہم سے ملاقات نہ ہوگی

شکر اس کا ادا نہیں ہوتا
تم نے مجھ سے مری شکایت کی

رعایتی اعلان

من و یزداں — ۸ر — مذہبی استفسارات وجوابات — ۲ر — نگارستان — للعہ — جمالستان — ۲ر — شہوانیات — للعہ

مکتوبات نیاز تین حصے — ۱۲ر — انتقادیات — للعہ — مالہ وماعلیہ — ۲ر — حسن کی عیاریاں — ۲ر — شہاب کی سرگزشت — ۲ر

فلاسفۂ قدیم — ۸ر — مجموعۂ استفسار وجواب جلد سوم — ۳ر — فراست الید — ۸ر — مذہب — ۸ر — نقاب اٹھ جانے کے بعد — ۸ر

میزان ۴۳ر

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف تینتالیس روپیہ میں مل سکتی ہیں

منیجر نگار لکھنؤ

اسلامی تعلیمات کا اثر عربوں پر

(ڈاکٹر سعید حسن - الہ آباد یونیورسٹی)

ہمارے فاضل دوست، ڈاکٹر سعید حسن عرصہ سے سیرت نبوی پر کام کر رہے ہیں اور امید ہے
کہ ان کی یہ تصنیف جلد شایع ہوجائے گی -
یہ مضمون اسی تصنیف کے بعض اوراق کا اقتباس ہے -

بعض مستشرقین اسلام قرآن اور رسول پر ایسے عجیب اعتراض کرتے ہیں، جو ذوق سلیم اور تنقید صحیحہ دونوں کے منافی ہے - ان مستشرقین کی عربی دانی اور موضوعات کے متعلق ان کا خصوصی مطالعہ مسلّم - لیکن ان کے اعتراضات سے پتہ چلتا ہے کہ یا تو انھوں نے قرآن کا غایر مطالعہ کیا ہی نہیں یا کرنا ہی نہیں چاہتے - ان مستشرقین میں لامانس کے یہاں یہ چیز ہم کو بہت نمایاں نظر آتی ہے گولڈ کے، سر ولیم مور، پروفیسر مارگولتھ وغیرہ بھی کبھی کبھی یہی غلطی کر جاتے ہیں - مثلاً قرآن کے متعلق نلڈکے کا خیال ہے کہ " اس کی بے ترتیبی، عدم اتساق اور اُلجھے خیالات پڑھنے والوں کی طبیعت کو مکدر کر دیتے ہیں" اسی طرح نلڈکے لکھتا ہے کہ عرب چونکہ ضعیف الفہم اور قلیل الادراک تھے، اس لئے جنت و دوزخ کا ذکر سن کر ان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے اور کم عقلی کی وجہ سے ان بے ترتیب باتوں کو سن کر ان پر بڑا اثر ہوتا تھا" لیکن افسوس ہے کہ ان مستشرقین نے اس پر بہت کم غور کیا ہے کہ خود اہل عرب قرآن کی بلاغت و فصاحت اور اُس کے معجزانہ اسلوب بیان کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے - ولید بن مغیرہ قریش کا با اثر شخص تھا - جس سے قریش عموماً رسول مقبول کے خلاف مشورہ کیا کرتے تھے - بیضاوی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ اس نے رسول اللہ کو سورۂ سجدہ کی تلاوت کرتے سنا تو وہ بے اختیارانہ کہہ اُٹھا کہ:- " ماھو من کلام الجنّ والانس، انّ لہٗ لحلاوۃً و انّ علیہ لطلاوۃً و انّ اعلاہُ لمثمرٌ و انّ اصفلہٗ لمعذقٌ و انہٗ یعلوا ولا یعلیٰ"۔

حضرت عمر قبول اسلام سے پہلے رسول اللہ کے جانی دشمن تھے لیکن ایک دن جناب بن ارتؓ کو سورۂ طٰہٰ کی تلاوت کرتے ہوئے سن کر اس قدر متاثر ہوئے کہ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوکر اسلام لانا ہی پڑا -

اس سلسلہ میں کلام مجید کے متعلق بعض غیر مسلم مصنفین کی رائے کا اقتباس بے جا نہ ہوگا - اٹھارھویں صدی کا مشہور مصنف جان جاک روسو قرآن مجید کے متعلق لکھتا ہے کہ " زبان عربی کا پورا علم نہ رکھنے والے قرآن کا مضحکہ اڑاتے ہیں حالانکہ اگر وہ اس قرآن کی لغوی و معنوی محاسن کو سمجھ سکتے تو کبھی اس کی جرأت نہ کرتے"

اسی طرح اُنیسویں صدی کا مشہور انگریز ادیب کارلایل لکھتا ہے کہ:- " مختلف ذوق رکھنے والی قوموں کا، قرآن کی اہمیت کا قایل ہونا قرآن کے اعجاز کی بڑی روشن دلیل ہے"۔ بیسویں صدی کا مشہور مصنف کلود فاربد لکھتا ہے کہ:- " کلام مجید کی آیات نہایت دلکش ہیں ان کا پڑھنا نہایت بھلا معلوم ہوتا ہے - اس میں عجیب پاکیزہ خوشبو ہے -

عصر حاضر کے ایک ادیب استاد محمد کرد علی اپنی تصنیف " حضارۃ العرب" میں لکھتے ہیں کہ:- " اگر قرآن نہ ہوتا تو اہل عرب کے پاس کوئی ادب بھی نہ ہوتا، دین کا کیا ذکر ہے"

نزولِ قرآن کا اثر ثقافتِ دین پر

بعثت کے وقت رسول اکرم کی عمر چالیس سال کی تھی۔ ترسٹھ سال کی عمر تک تبلیغِ رسالت کا اہم فرض انجام دینے کے بعد آپ نے رحلت فرمائی۔ اس زمانہ میں احکام خداوندی کے مطابق، جن کا نزول وحی کی شکل میں ہوتا رہا، آپ نے شریعت کی تکمیل فرمائی۔ مکہ کے دورانِ قیام میں دو تہائی قرآن نازل ہوا، جس کا تعلق تزکیۂ نفس، عقاید وعبادات اور اخلاق حسنہ کی تعلیم سے تھا۔ اس کے بعد نبی کریم کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، جب آپ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ میں انصار کے پاس پناہ گزیں ہوئے، ہجرت آپ کی عملی زندگی کا بڑا اہم واقعہ ہے، مدینۂ منورہ پہونچکر آپ نے مختصر سی مسلم جماعت کی تنظیم فرمائی، عبادات کے معاملات اور اخلاقی اصول جنھیں آپ نے مکہ میں مجملاً بیان فرمائے تھے، مدینہ میں بالتفصیل بیان فرمائے۔ خرید و فروخت، ازواج، طلاق وغیرہ کے اصول مقرر کئے، اور اہلِ عرب کے لئے ایک بڑا پاکیزہ آئین پیش کیا، آپ اس سلسلہ میں دینی مسایل پر اہلِ مکہ سے بھی بحث کرتے تھے اور یہودیوں سے بھی مباحثہ فرماتے تھے، کیونکہ یہودیوں کو اپنی آسمانی کتاب اور اپنے پیغمبر پر بڑا ناز تھا۔ اہلِ کتاب ہونے کی وجہ سے یہودی اپنے کو افضل سمجھتے تھے۔

اسلام سے پہلے عربوں کا کوئی خاص قانون نہ تھا۔ باہمی اختلاف کی صورت میں وہ اپنے سرداروں سے رجوع کرتے تھے، اور وہ جو چاہتے فیصلہ کر دیتے تھے لیکن رسولِ اکرم نے عربوں کے لئے دینی، اجتماعی، سیاسی قوانین مرتب کرکے اس بے اصولی کو ختم کر دیا۔

رسول اللہ نے ہیئت اجتماعی کے مفاد کے معاملاتِ زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے جو کچھ کیا اس کی فہرست بہت طویل ہے۔ بیع وشراء میں دیانت وصداقت کی تاکید، غریبوں اور بے نواؤں کے ساتھ خلوص ومحبت کی تلقین، عورت کے ساتھ حسنِ سلوک، والدین اور ہمسایوں کے ساتھ نیکی کرنے کی ہدایت، ایفائے عہد ومیثاق کی تاکید، نسبی شرافت سے قطع نظر صرف تقویٰ کو مایۂ افتخار قرار دینا اور مالک وغلام دونوں کو ایک سطح پر لے آنا اور اسی طرح کی سیکڑوں باتیں جن سے رسول اللہ کے ذہنی واخلاقی بلندی کا پتہ چلتا ہے اور جن پر اسلامی ثقافت کی بنیاد قایم ہوئی تھی۔

سیاسی اثر

ظہور اسلام سے پہلے عرب بڑی منتشر زندگی بسر کرتے تھے، قبایل سالہا سال ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔ ان کی نسلاً بعد نسلٍ دشمنی اور کینہ پروری ضرب المثل تھی، لیکن اسلام نے عربوں کی اس ذہنیت کو جس طرح بدلا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے:۔ جب نجاشی شاہ حبشہ نے مہاجرین سے اسلام کے بابت دریافت کیا تو جعفر بن ابی طالب نے مہاجرین کی نمایندگی کرتے ہوئے کہا:۔ "اے بادشاہ! ہم گمراہ اور جاہل تھے۔ بتوں کی پرستش کرتے تھے اور مُردار کھاتے تھے۔ بُرے کام کرتے تھے۔ اپنے عزیز اور ہمسایوں کے ساتھ بُرا سلوک کرتے تھے، زبردست زیردست کو ہلاک کر دیتا تھا۔ اس حالت میں خدا نے ہمارے لئے ایک پیغمبر بھیجا جو ہم میں سے ہے اور جس سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ جس کی صداقت، امانت وعفت پر ہم کو اعتماد کامل ہے، اس پیغمبر نے ہم کو خدائے واحد کی عبادت کی تعلیم دی۔ اور پتھروں کے پوجنے کی ممانعت کی۔ لوگوں کے ساتھ سچائی اور نیکی سے پیش آنے کی ہدایت کی۔ صلۂ رحم کی تاکید کی۔ خونریزی، دروغ، افترا، یتیم کا مال غصب کرنا، اور عورتوں پر تہمت لگانا ممنوع قرار دیا۔ نماز اور روزہ اور زکوٰۃ کو لازم قرار دیا۔ چنانچہ ہم نے اس پیغمبر کی تصدیق کی اور اس پر ایمان لائے اور جس چیز کو حرام قرار دیا، ہم نے بھی اُسے حرام تسلیم کیا۔"

گولڈ زیہر اپنی تصنیف "دراسات اسلامیہ" میں لکھتا ہے کہ:۔ "مصلحت عام کے مقابلے میں مصلحت ذاتی کا ایثار، اُمور دینوی اور فانی اغراض سے استغناء، بے جا ناز وافتخار سے اجتناب، یہ اسلام کی خاص تعلیمات ہیں۔" نلدکے کو بھی ایک جگہ لکھنا ہی پڑا کہ:۔ "عربوں کا جذبۂ انتقام ترک کرنا اسلام کا بڑا کارنامہ تھا۔ اسلام سے پہلے عرب بدلہ نہ لینے کو زبردست عار وذلت خیال کرتے تھے لیکن اسلام کے بعد انھیں عربوں نے خون بہا لینا ذاتی حق نہیں تصور کیا۔ اسلام سے پہلے عربوں کے لئے کسی ایک شخص کو اپنا لیڈر تسلیم کرنا مشکل تھا۔ لیکن اسلام کے بعد انھوں نے رسول کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بُت پرستی ختم ہوگئی اور عربوں نے ایک قلیل مدت میں ناصا اقتدار حاصل کر لیا۔" ولیز لکھتا ہے کہ:۔ اسلام ایسی لاہوتی پیچیدگیوں سے جو عیسائیت میں بھری پڑی تھیں خالی تھا، اور اس سے وہ اس قدر جلد ترقی کر گیا۔" سر ولیم میور اپنی کتاب "حیاتِ محمد" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔ "محمد اپنے کلام کی وضاحت اور سادگی تعلیم کے لحاظ سے اپنا مثل نہ رکھتے تھے اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ تاریخ نے ایسا بیدار مغز مصلح کوئی دوسرا پیدا نہیں کیا۔

داغ

(اپنے خطوط کے آئینہ میں)

(سید محمد رفیق مارہروی)

اگست ۱۹۴۸ء میں میرا ایک مضمون "داغ اور مُنّی بائی حجاب" نگار میں شائع ہوا تھا، یہ مضمون اس روزنامچہ سے مرتب کیا گیا تھا جو میرے والد مولانا احسن مارہروی اور میرے ایک بزرگ مولوی افتخار عالم صاحب مارہروی نے دورانِ قیام حیدر آباد لکھا تھا، لیکن مُنّی بائی حجاب کا ذکر اس مضمون میں تشنہ رہا، امسال جب میں نے اس روزنامچہ کو بغرض اشاعت از سرِ نو ترتیب دیا اور مرزا داغ دہلوی کے خطوط[1] وغیرہ کی تلاش کی تو مجھے بہت سے خطوط ایسے ملے جن سے داغ کی رنگین زندگی کے اور پہلو بھی سامنے آجاتے ہیں اور انھیں کے پیش نظر یہ مضمون تحریر میں آیا ہے - مرزا داغ نے اگر طوائفوں سے دل بہلایا اور اُن کے حسن وجمال کے گیت گائے تو اس کا سبب فطرت کے تقاضے کے علاوہ اس زمانہ کا دستور بھی تھا۔

میر کا عطار بچہ، غالب کی ستم پیشہ ڈومنی، مومن کی صاحب اور شیفتہ کی مسماۃ رجو سب اسی ذوق کی شہادتیں ہیں - داغ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ یکسر حسن وعشق کی دنیا تھا، انھوں نے ہوش سنبھالا تو قلعۂ معلیٰ کی رنگ رلیاں دیکھیں، حسن پرستی کا سب سے پہلا سبق ان کو قلعۂ معلیٰ ہی میں ملا، قلعہ کی بربادی کے بعد جب وہ رام پور پہونچے تو وہاں بھی انھیں حسن وعشق ہی کی دُنیا ملی، شاہد پرستی کا جو درس داغ کو قلعۂ معلیٰ میں ملا تھا رام پور میں اس کی تکمیل ہوئی۔

حضرت داغ رام پور پہونچے تو نواب یوسف علی خاں کا دورِ حکومت تھا، لیکن نواب نے ان کی زیادہ قدر نہ کی، جب نواب کلب علی خاں تخت نشین ہوئے تو وہ مستقل طور سے ریاست کے ملازم ہوگئے، نواب کلب علی خاں بڑے زندہ دل رئیس تھے اور دہلی کے اُجڑنے کے بعد اچھے اچھے فن کاروں کا اجتماع رام پور میں ہوگیا تھا، نواب نے میلۂ بے نظیر کی بنیاد ڈالی جو ایک طرح سے دہلی کے پھول والوں کے میلے کا جواب تھا، اس میلے میں ارباب نشاط کا اجتماع بھی ضروری تھا اور مختلف اطراف سے مشہور طوائفیں اور گویّے اس میلے میں شریک ہوتے تھے .... انھیں میں ایک کلکتہ کی منی بائی حجاب تھی جس پر داغ مایل ہوگئے، فرماتے ہیں :-

پھر ہوئیں دل میں حسرتیں آباد — نالے دینے لگے مُبارک باد
پھر ہوا شوق جبہ سائی کا — پھر جما رنگ آشنائی کا
دیکھ کر اس پری شمائل کو — رہ گیا تھام تھام کر دل کو

کس قیامت نے پائمال کیا
سحرِ بنگالہ نے ہلال کیا

حجاب کچھ روز رام پور رہ کر کلکتہ واپس گئیں اور داغ سے عہد و پیمان ہوئے کہ اگلے سال پھر آئیں گے اور اس دوران میں خط وکتابت کا سلسلہ جاری تھا، اس حقیقت کا اظہار مثنوی فریاد داغ سے ہوتا ہے :-

---

[1] داغ کے خطوط کا یہ مجموعہ "زبان داغ" کے نام سے شایع کرا چکا ہوں -

ٹھہرے عہدِ وفا جو آپس میں کھائی باہم ہزار ہا قسمیں
رسمِ اُلفت کے ہو گئے اقرار خط کتابت کے ہو گئے اقرار

حجاب کے جانے کے بعد، داغ نے ایک خط لکھا، اس کا جواب جب نہ ملا تو ایک دوسرا خط لکھا گیا۔

دل دار و دل نواز!

کیا غضب ہے، آنکھ سے اوجھل ہوتے ہی وہ سب قول و قرار یک لخت فراموش کر دیئے، خط روانہ کیا تھا، وہاں کی دلچسپیوں میں اتنی محو کہ جواب دینا محال، کیا میرے سینے میں دل نہیں یا دل میں تڑپ نہیں، کیا بے قرار ہونا مجھے نہیں آتا، کیا تلملانا میں نہیں جانتا، اس خط کا جواب جلد سے جلد نہ آیا تو خود بازار جا کر زہر لاؤں گا اور بے موت مر کر دکھا دوں گا، تم سے وعدہ لیا تھا اور تم وعدہ کر کے گئی تھیں کہ روز نہیں تو ہفتے میں دو بار خط ضرور لکھا جائے گا، آج دس دن ہو گئے نہ خیر ہے نہ خبر اور اگر کچھ نہ لکھتیں تو خیریت ہی۔ اطلاع دیتیں، یہاں تو جس روز سے گئی ہو جان پر بنی ہے کوئی بات اچھی نہیں لگتی جب تک تمہارا خط نہ آئے دل کو کیسے چین آئے۔ (زبانِ داغ)

ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں داغ اور حجاب کے مابین خط و کتابت رہی ہو لیکن اس زمانہ کا اور کوئی خط دستیاب نہ ہو سکا، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کچھ روز خط و کتابت رہی ہو گی اور اس کے بعد حجاب کلکتہ کی دلچسپیوں میں محو ہو گئی ہوں گی لیکن داغ انھیں نہ بھول سکے، بہادر خاں انجم نیشاپوری کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

حجاب سے بے وجہ ترک نامہ و پیام ہے، کم بخت ایک بلائے بے درماں تھی کہ جس کے تصور سے اب تک نجات نہیں ہے، ہر چند اب بہت صبر آ گیا ہے، لوگوں نے یقین ہے اس کو بہکایا، خدا ان کو غارت کرے، داغ کے مزاج میں بے وجہ عتاب کی تاب نہیں، آپ نے ناحق میری تصویر اُن کو بھیجی، میں ان سے کمال ناراض ہوں، آج کچھ طبیعت اچھی نہیں ورنہ گرما گرم جواب دیتا

(زبان داغ)

دوسرے سال میلۂ بے نظیر کے آتے ہی داغ کو حجاب کے بلانے کا پھر موقع ہاتھ آیا، انھیں بڑے شوق سے طلب کیا، اس زمانہ کا ایک خط ملاحظہ ہو :-

بائی جی، سلام شوق

غضب تو یہ ہے دور بیٹھی ہو، پاس ہوتیں تو سیر ہوتی، کبھی تمہارے گرد گھومتا اور شعلۂ جوالہ بن جاتا، کبھی تمھیں شمع قرار دیتا اور پتنگا بن کر قربان ہو ہو جاتا، کبھی بلائیں لیتا اور کبھی صدقے قربان ہو جاتا، ایک خط بھیجا ہے ابھی اس کے انتظار کی مدت ختم نہیں ہوئی کہ یہ دوسرا خط لکھوانے لگا خدا کے واسطے جلد آؤ یا تاریخ آمد مقرر کر کے اطلاع دو، شب و روز انتظار میں گزرتے ہیں، وہاں کے لوگ کیونکر خوشی سے اجازت دیں گے تم ہی پیا ہو گی تو روانگی ہو سکے گی، میں تمہارے لئے بلبلا رہا ہوں، یہ خوفناک کالی کالی راتیں کیا کہوں کیونکر تڑپ تڑپ کر صبح کی صورت دیکھتا ہوں، یقین جانو ایسے تڑپتا ہوں جیسے بلبل قفس میں، میرے دونوں خطوں کا جواب آنا ضرور ہیں۔ (زبانِ داغ)

حجاب آئیں اور داغ کے لئے مژدۂ راحت لائیں، لیکن اس دفعہ داغ کو ایک دوسری مشکل کا سامنا کرنا پڑا، نواب کلب علی خاں کے چھوٹے بھائی صاحبزادہ حمید علی خاں کو بھی حجاب سے دلچسپی پیدا ہو گئی، حجاب بھی ادھر راغب ہو گئیں، مرزا داغ کو یہ بات سخت ناگوار گزری مگر بے بس تھے، حجاب کو ایک رقعہ لکھ کر دل کا بخار نکالا۔ ملاحظہ ہو :-

ستم گر دستم پیشہ! شوقِ ملاقات کے بعد مدعا نگار ہوں کہ تم دو روز سے نواب صاحب کے یہاں تھیں، یہاں دل عجیب عالم گزر گیا میں نہیں مانوں گا کہ تم مجبور ہو گئیں اس ریاست میں ایسی بھی خدا کی بندیاں موجود ہیں کہ رئیس کے ہزار دباؤ

پر بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتیں جن سے واسطہ ہے اور جن سے وفاداری کا عہد کر چکی ہیں اپنے قول پر قائم ہیں، ایک طرف دولت ہے ریاست ہے اور ہر طرح کی شان و شوکت ہے لیکن محبت کا نام وہاں عنقا رکھا گیا ہے تمھارا دل وارہ ان کے مقابلہ میں کوئی خوبی نہیں رکھتا اگر تمھاری الفت میں جان سے گزر سکتا ہے، کیا میرے رقیب بھی ایسا کر سکتے ہیں، تم کو یقین ہے؟ اور جب نہیں کر سکتے تو پھر کس لئے تم داغ سے پرستار کو محو کئے ہوئے ہو، دل پر جبر کر کے لکھتا ہوں کہ اگر واقعی ترکِ تعلق منظور نہیں تو پھر مجھے دید و شنید سے کیوں محروم رکھا جاتا ہے۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

یہ رقعہ تمھیں جلانے کے لئے نہیں لکھا ہے نہ اس کا مطلب طعن و تشنیع ہے، مدعا ہے کہ آپ تشریف لائیں اور میری کچھ دلداری فرمائیں۔ (زبان داغ)

حجاب راہِ راست پر نہ آئیں، داغ نے جل کر ایک رقعہ اپنے دوست کو لکھا، وہ بھی ملاحظہ ہو:-

محبِ داغ! — اگر آپ مجھے یہ لکھیں کہ نواب صاحب کی بلائی ہوئی حجاب گئی تھیں یا خود انھوں نے دورے ڈالے تھے تو بڑی ہی بندہ نوازی ہوگی، میرا دل و دماغ پھک چکا ہے، دل میں زخموں کی حد نہیں رہی اور پھر یہ روز روز کی نمک پاشی تلملایا جاتا ہوں، آپ طرفین کے حالات سے واقف ہیں، خوب معلوم ہے آپ کو کہ نواب صاحب کے مقابلہ میں سوا اس کے کہ اپنے عشق کی آگ میں جل بھن کر کباب ہو جاؤں، کچھ نہیں کر سکتا، آپ شاید نواب صاحب سے کہہ سکیں کہ داغ، حجاب کے تیرِ نظر سے بے طرح گھایل ہے آپ کی دلبستگی کے لئے اور بھی سامان ہیں لیکن بے چارا داغ، حجاب کو نہ پائے تو کہاں جائے اور اگر کہیں جائے تو وہ پھانس جو دل میں پیوست ہے کیسے دور ہو۔ جواب کے انتظار میں بے چین ہوں۔ (زبان داغ)

یہ زمانہ داغ کے لئے بڑی اذیت کا تھا، معشوق بے وفائی پر کمربستہ، دل و دماغ محبت سے معمور، کسی پہلو مرزا داغ کو قرار نہ تھا، اسی حال میں زخم پر چوکے کے مصداق ایک ایسی محفل میں داغ کو شرکت کا موقع ملا جہاں حجاب بہت ہی بے حجاب نظر آئیں، داغ نے جل کر حجاب کو خط لکھا، دیکھئے کس دل سوزی سے اظہار حال فرماتے ہیں:-

بے مہر و بے وفا! — کل اس محفل سے با دلِ داغدار اور یاس و حرماں کا گہرا چرکہ کھا کر آیا ہوں اس وقت سے سوچ رہا ہوں کہ آخر یہ تماشا کب تک معاملہ یک سو ہونا ضروری ہے، صبح و شام ہوتے ہوتے اتنا زمانہ گزر گیا، آخر کوئی حد بھی ہے کب تک مطاعنِ جگر دوز سنوں، کلیجے میں ناسور پڑ گئے ہیں، اب تو ان کا علاج کرنا ہی ہوگا، کہئے آپ کے دل کی ہوس گھٹی یا بڑھی، وہ آدمی ضرور بے حس ہے اور اس کے دل میں بجائے دل کے فولاد کا ٹکڑا رکھا ہوا ہے جو یہ منظر دیکھے اور چپ رہے، بے شک تم نے حرملہ اور ابن سعد کے گلے میں باہیں ڈالیں، تم بے شک خولی اور ابن نمیر کی گود میں بیٹھیں اور تم یقیناً یزید کی معشوق بنیں، میرے جسم میں خون ہانڈی کی طرح پک رہا تھا میں یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب شکرے مل کر نوچا کھسوٹا کریں، آخر یہ کیا سر میں سمائی ہے، کون جانے اس کا کیا انجام ہو، یہی لیل و نہار ہے تو داغ کا سلام قبول ہو، دل پر سبر کی سل رکھوں گا مگر تمھارا نام نہ لونگا آخر بے حیائی کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔ (زبانِ داغ)

جس کوفت اور اذیت کا ذکر مرزا داغ نے اوپر کے خط میں کیا ہے بالکل یہی نقشہ انھوں نے مثنوی فریاد داغ میں کھینچا ہے، دو چار شعر مثنوی کے بھی ملاحظہ فرمائیے:-

ابھی کیا جانو وضع داروں کو — دیکھ لوگے وفا شعاروں کو
وضع نبھتی ہے وضع داروں سے — یا اطاعت کے خواستگاروں سے

وہ کہیں پاسِ وضع کرتے ہیں — جو یہ جانیں کہ ہم پہ مرتے ہیں
طور سب غیر غیر دیکھو گے — چار دن بعد سیر دیکھو گے
میرے کہنے کی داد دو گے تم — نام ان کا کبھی نہ لو گے تم،

بالآخر یہی ہوا نواب صاحب کا حجاب سے دل بھر گیا اور بے رخی اختیار کی، حجاب سخت نالاں ان سے رخصت ہوئیں داغ کی آغوشِ محبت ایک سچے عاشق کی طرح اس حالت میں بھی کھلی ہوئی تھی، انھوں نے حجاب کو اپنے یہاں بلانا چاہا۔ حجاب شرمندہ و شرمسار تھیں، آئیں نہیں بیمار بن گئیں خیال تھا کہ بیماری کا حال سن کر داغ خود پہونچیں گے، اس واقعہ کی صراحت میں داغ کا ایک خط ملاحظہ ہو جو انھوں نے حجاب کی بہن حمیدن بائی نقاب کو لکھا تھا:-

بی حمیدن بائی، تم نے یہ خوب سنائی کہ وہ آنے والی تھیں، مگر ناگہاں طبیعت خراب ہوگئی جان کے لالے پڑ گئے، وہ تو زندگی تھی کہ دو تین گھڑی دورے سے تکلیف اٹھا کر وہ ٹھیک ہوگئیں، کل خاں صاحب بھی آئے تھے ان سے دیر تک ذکر رہا وہ دیر تک وہاں بیٹھ کر آئے تھے انھوں نے تو اس قسم کی کوئی بات نہیں کہی جس سے ناگہاں علالت کا پتہ چلتا، یہ کیا بات ہے آخر ایسا مجھے کیوں لکھا گیا اس سے ان کا کیا مقصد تھا، کیا میری آزمائش منظور تھی، سوچتی تو ہوں گی کہ داغ کتنا سنگ دل ہے تکلیف اور بیماری کا حال سن کر بھی بھاگا ہوا نہیں آیا اور اگر کسی وجہ سے آنا ممکن نہ تھا تو خیر خبر بھی نہ لی۔

کچھ روز ایسے راز و نیاز عاشق و معشوق میں رہے بالآخر منی بائی حجاب، داغ کے پاس آگئیں اور تقریباً دو ماہ انھوں نے مرزا صاحب کے پاس رام پور میں گزارے، اس واقعہ کا ذکر مرزا داغ نے مثنوی فریاد داغ میں بھی کیا ہے، ملاحظہ ہو:-

میرے غم خوار جا کے لائے انھیں — نہ بنی کچھ بغیر آئے انھیں
آئے لیکن ہزار ناز کے ساتھ — ملے مجھ سے تو احتراز کے ساتھ
پہلے کچھ بات کی تو رُک رُک کر — پھر کہا میرے کان میں جھک کر
..... — .....
..... — .....
..... — .....
گزرے اوقات عیش و عشرت سے — دو مہینے تک ایک صورت سے

دو ماہ دادِ عیش دے کر منی بائی حجاب کلکتہ واپس گئیں، مرزا داغ پر جو کچھ گزر گئی اس کا پتہ داغ کے ایک خط سے چلتا ہے جو انھوں نے انجم صاحب کو لکھا تھا:-

وہ قافلہ لکھنؤ سے عظیم آباد پہونچا، وہاں سے ایک قیامت نامہ میرے نام آیا جس کا مضمون قابلِ تحریر نہیں، میں چاہتا ہوں کہ جو حال آپ نے دیکھا ہے وہ میری کیفیت کسی اور سے نہ کہنا خدا کے واسطے خاک میں نہ ملا دینا۔

مثنوی فریاد داغ میں بھی اس کا ذکر انھوں نے کیا ہے:-

صبح کو وہ ادھر سوار ہوئے — ہم اجل کے امیدوار ہوئے
زندگی بھر یہ کب ہوا صدمہ — پہلے کیا تھا جواب ہوا صدمہ
گو سراسر ملال تھا وہ ہجر — اس کے آگے وصال تھا وہ ہجر

حجاب کی جدائی نے مرزا داغ کو ہجر و فراق کی صعوبتوں میں گرفتار کر دیا، اس زمانہ میں جو حجاب و داغ میں خط و کتابت ہوئی بڑی پر لطف ہے ایک خط کا کچھ حصہ لکھتا ہوں:-

نیک بخت، پاکدامن، بے لوث منی بائی صاحبہ حجاب، سلامت رہئے۔ گستاخی معاف، گزارش واقعی ہے، نہ شکایت بے جا، کیا خوب مجھ پر ایک آسمانِ حوادث ٹوٹ پڑے، میرے دانت نکل جائیں اور آپ دانت نکال کر ہنسیں، سلامتی سے پورا خط دیکھنے کی ضرورت نہیں اگر دیکھا تو سمجھے کون، غرض کس کو، توجہ کیسی، کوئی کل مرتا آج مرجائے تو گھی کے چراغ جلیں، پہلے خط میں لکھدیا ہے کہ صاحب سب قسم کے دانت ایک آدمی کے منہ کے لایق بھجوادیجئے، دنیا جانتی ہے کہ ۳۲ دانت ہوتے ہیں۔ (زبانِ داغ)

اسی زمانہ میں کسی اخبار میں منی بائی کے انتقال کی خبر شایع ہوئی، مرزا یہ خبر سن کر بہت پریشان ہوئے اور فوراً منی بائی کو ایک خط لکھا گیا:-

منی جان، تمھیں اللہ کی امان! اس وقت دن کے گیارہ بجے ہیں، منشی عبدالرحیم خاں صاحب میرے پاس اخبار انگریزی لائے بہت پریشان آئے، میں نے کہا بخشی خیر تو ہے کہا بائی جی کا کچھ حال ہے، یہ سنتے ہی ہوش و حواس جاتے رہے، انھوں نے ترجمہ کیا، مجھے یقین ہوا، کوئی اور منی ہوگی، آب و دانہ حرام ہوگیا، دل کو سمجھاتا ہوں، نہیں مانتا، ترجمے کو دیکھ کر کیفیت مفصل لکھو زیادہ خیریت۔۔۔۔۔ (زبانِ داغ)

جب ہجر و فراق کی بے کلی حد سے گزری اور منی بائی کی یاد نے بہت بے چین کیا تو داغ نے کلکتہ جانے کی ٹھہرائی، ادھر سے بھی کلکتہ آنے کے تقاضے ہو رہے تھے۔ کلکتہ جانے کا جب ارادہ قطعی ہوگیا تو منی بائی کو خط لکھا گیا:-

مہربانِ داغ! قدردانِ داغ! سلامت رہو،

جی تو یہی چاہتا تھا کہ دو دن میں اڑ کر چلا جاؤں، مگر طاقتِ سفر ابھی کہاں، گرمی وہ پڑتی ہے کہ الامان، گلِ نیلوفر، دھنیا، تخمِ پالک، خیارین، شربتِ آلو بینے کو ملتا ہے، حرارت بڑھی ہوئی ہے، مانع سفر ایک اور امر ہوا، ہندو مسلمان میں جھگڑا پھیلا ہوا ہے، دیکھئے کیا ہوتا ہے، اس کا انتظام ضرور ملحوظ رہے، لہذا حسب تجویز سرکار عالی وقار چودھویں محرم شریف یوم روانگی مقرر ہوا، اللہ راس لائے اور تم سے ملائے، یہ بھی ارشاد ہو کہ بے اطلاع آؤں یا با اطلاع پہلے دردولت پر سلام کرنے کو حاضر ہوں یا اور کہیں ٹھہروں، میاں عبدالرزاق کو مکان کے لئے تار دوں گا اور جو تم کوئی مکان تجویز کردو گی تو بہت انسب ہوگا مگر جلد اطلاع دو اور جو شے یہاں کی مطلوب ہو وہ ساتھ لیتا آؤں ؎

سب سے ہے میری آرزو بڑھ کر
آرزو سے ہے آبرو بڑھ کر

بہت دل شکستہ اور ارمان بھرا بے سروپا آتا ہوں، میری لاج تمھارے ہاتھ ہے یا خدا کے ہاتھ، تمھارے گھٹنے کے درد نے بے چین کردیا۔ (زبانِ داغ)

داغ نے کلکتہ کا سفر اس طرح کیا کہ پہلے لکھنؤ گئے، پھر اپنے محبِ خاص انجم نیشاپوری کے یہاں قیام فرمایا، لکھنؤ کچھ روز رہ کر عظیم آباد پہونچے وہاں داغ کے اخیافی بھائی مرزا شاغل موجود تھے ان کے توسل سے میر باقر کے یہاں قیام فرمایا، عظیم آباد میں داغ کی کچھ اس نوع کی قدر افزائی ہوئی کہ انھوں نے کچھ روز بڑے لطف کے ساتھ وہاں قیام فرمایا، مختلف مشاعرے ان کی آمد کی یادگار میں ہوئے، وہاں کے خواص نے ان کی شایانِ شان قدردانی فرمائی، عظیم آباد سے ایک خط انجم نیشاپوری کو مرزا صاحب نے لکھا، اس میں لکھتے ہیں کہ:-

میں بخیر و عافیت وارد عظیم آباد ہوا، محلہ گرہٹہ مکان سید باقر صاحب میں مقیم ہوں، اہلِ عظیم آباد نے میری اس قدر خاطر و عزت کی ہے کہ جس کی حد نہیں، کلکتہ نہیں جانے دیتے۔۔۔۔ (زبانِ داغ)

برسات کے موسم میں داغ کلکتہ پہونچے، ناخدا کی مسجد کے سامنے قیام فرمایا اور شب و روز ملاقاتِ یار سے لطف اندوز ہونے لگے۔ ان کیفیات کا نقشہ انھوں نے مثنوی فریادِ داغ میں اس طرح کھینچا ہے:-

بخت بیدار و یار ہے دمساز اے شبِ وصل تیری عمر دراز

صبح سے شام تک جمال کے لطف — شام سے صبح تک وصال کے لطف
وصل کی شب میں جلوے تھے دنگے — سرمہ تھا حلق میں موذن کے
عیش و عشرت کی بات بات اچھی — رات سے دن تو دن سے رات اچھی

تقریباً دو ماہ مرزا داغ کلکتہ رہے، انھوں نے تو اور رہنا چاہا لیکن ملازم تھے، باوجود کوششِ بسیاراں کو زیادہ رخصت نہ مل سکی اور وہ باحد غم و افسوس کلکتہ سے واپس رام پور ہوئے ؎

اہلِ صحبت کو داغ دے کے چلے — اپنے دل کا جنازہ لے کے چلے،
کیا کہیں کس طرح سے ہم آئے — ہمہ تن حسرت و الم آئے

رام پور پہونچکر داغ پھر آتشِ فراق میں جلنے لگے اور حجاب کی طلب بدستور رہی، مثنوی فریادِ داغ میں ایک جگہ فرماتے ہیں :-

یا الٰہی نجات غم سے ملے — وہ سراپا حجاب ہم سے ملے
ورنہ اس کا خیال بھی نہ رہے — اب ہے جیسا یہ حال بھی نہ رہے

اس کے بعد مرزا داغ اور حجاب میں کیا تعلقات رہے اس پر روشنی ڈالنے کے لئے ہمارے پاس کوئی خط نہیں البتہ دو ایک خط ایسے ضرور موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ داغ نے دوبارہ کلکتہ جانے کا ارادہ کیا تھا لیکن یہ ارادہ پورا نہ ہوا، کلکتہ کے قیام کے دوران میں دو ایک مشہور طوائفوں سے بھی ملے تھے جن میں ملکہ جان اور اس کی دختر گوہر جان قابلِ ذکر ہیں، ملکہ جان کے نام کچھ خط بھی مرزا صاحب کے دستیاب ہوئے ہیں، ایک خط کی کچھ عبارت ملاحظہ ہو جو ملکہ جان کو لکھا گیا تھا :-

ملکۂ اقلیم سخن دریؔ[1]، بنارس کی صنم، کلکتہ کی پری، دام جمالہا و کمالہا !- کیوں جی خدا نے مجھے کیوں عاشق مزاج بنایا، اس بلا میں کیوں پھنسایا، پتھر کا دل لوہے کا کلیجہ کیوں نہ بنایا، جس میں کوئی اچھی ادا دیکھی، طبیعت لوٹ ہوگئی خصوصاً کوئی معشوق خواندہ ہو اور شعر گو بھی تو مرزا داغ کی موت ہے .....

ایک خط کے چند جملے اور ملاحظہ ہوں :-

دل ربا، سخن آرا، حور لقا، پری ادا دام جمالہا و کمالہا

تمہارا پہلا خط جو ایک دفتر شکوہ و شکایت، مجموعۂ رشک و رقابت تھا، میرے پاس پہونچا، اس کا جواب مناسب میں نے تمہارے مکان پر بھیجا اور نہ پہونچا، بڑے افسوس کی بات ہے، نہایت بدانتظامی اور کم توجہی گوہر جان کی متصور ہے .....

حجاب سے دل لگی ہوگئی تھی ایک داستان طول طویل ہے اگر وہ حال تم کو مثنوی فریاد داغ سے ظاہر ہوا ہوگا، سر مو فرق نہیں ہے، مختصر یہ کہ اس شخص کا میں بہت ممنون، اس رام پور میں تلوار کی دھار پر مجھ سے ملی اور اس ملاقات کو ایک آدمیت اور اطاعت کے ساتھ بے غرضانہ کلکتہ تک نبھایا، اس ملاقات کی شہرت تو کیا رسوائی تمام میں ہوئی مگر جدائی بھی ایسی ہوئی کہ ملاقات کی اُمید نہ رہی، میں ایک ریاست کا نوکر اہلکار کلکتہ میں ہمیشہ کیونکر رہ سکوں، اتنی مقدرت کہاں سے لاؤں، ترکِ روزگار کیونکر ہوسکے کہ یہ وسیلۂ آبرو اور حیلۂ معاش ہے، بائی جی کو یہ ضد بے ہودہ ہوئی کہ تمام عمر رام پور کی صورت نہ دیکھوں ....

میرے خمیر میں عشق ہے، میں وفا کا پتلہ ہوں، جو مجھ سے ملا اور مل کر چھوٹا یاد کرتا رہا .....

درحقیقت مرزا داغ، حجاب سے مایوس ہوگئے تھے اور چونکہ ازلی حسن پرست تھے اور کسی ایک کو بغرض تفریح لگائے رکھنا اُن کی عادت میں داخل تھا، لہٰذا ملکہ جان کی طرف بھی راغب ہوئے، ملکہ جان سے آئندہ کیا تعلقات رہے اس کی کوئی صراحت نہیں ملتی، داغ بہت جلد کلکتہ کی فضا کو بھول کر

---

[1] ملکہ جان شاعرہ بھی تھی، اس کا دیوان بھی شائع ہوا تھا۔ اصل وطن بنارس تھا۔

رام پور کی دلچسپیوں میں ڈوب گئے، نواب کلب علی خاں کی وفات کے بعد مرزا داغ رام پور سے دل برداشتہ ہوئے اور نوکری ترک کردی ایک مدت تک دہلی اور بعض دوسرے مقامات کی سیر فرمائی اور جب کہیں سبیل معاش نہ ہوسکی تو حیدر آباد روانہ ہوئے اور وہاں ایک مدت امیدوارانہ گزارنے کے بعد سرفراز ہوئے اور رفتہ رفتہ وہاں انھیں کافی اعزاز نصیب ہوا، نظام دکن کی استادی کا شرف حاصل ہوا اور فکرِ معاش سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہوگئے۔

مادی اعتبار سے آسودہ و مطمئن ہونے کے بعد مرزا داغ کو پھر حجاب یاد آئیں، نامہ و پیام شروع ہوگئے، حجاب کی طلبی میں خط لکھے جانے لگے، علاوہ ان خطوط کے داغ و منی بائی کے حالات معاشقہ اس روزنامچہ میں بھی درج ہیں جو مولانا احسن مارہروی نے مرتب فرمایا تھا، اس معاملہ کی ایک یادداشت ملاحظہ ہو:۔

آج کی نشست میں مرزا صاحب بولے کہ آج میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے، حاضرین میں سے بارق صاحب نے پوچھا کہ جب ایسا ہوتا ہے تو کیا ظہور میں آتا ہے، ہنس کر بولے کہ بائیں آنکھ پھڑکتی ہے تو خوشی اور اگر دائیں تو رنج ہوتا ہے، میں نے عرض کیا آثار اچھے ہیں آپ کی بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے کچھ بہتر ہی ہوگا، یہ واقعہ صبح کا تھا شام کو جب میں حسب معمول پہونچا تو مرزا صاحب بولے دیکھو سید ہم نہ کہتے تھے کہ ہماری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے کوئی خوشی ہوگی، آج کی ڈاک میں منی بائی کا خط آیا ہے، لو تم بھی پڑھ لو جواب کل صبح لکھا جائے گا، میں نے خط پڑھا جس کا مضمون یہ تھا:۔

حاجی صاحب! تسلیم!

آپ کہتے ہوں گے منی مرگئی، یہ سب کچھ نہیں، نہ مری ہوں اور نہ آپ کو بھول سکتی ہوں ایک عشرے سے کچھ زائد ہوا بہن یکایک بیمار ہوگئی، معمولی بخار تھا، اس نے سرسامی صورت اختیار کرلی، سارا گھر پریشان تھا، میں اس کی تیمارداری میں لگی تھی، آج شیخ جی نے آپ کا اشتیاق سے بھرا خط دیا، اسی وقت یہ چند جملے لکھ کر روانہ کرتی ہوں، آپ مطلق وہم دل میں نہ لائیں، ذرا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، بیمار کا حال اب بہتر ہے، حکیم صاحب کی خاص توجہ ہے آپ کا خط آتے آتے وہ یقیناً چنگی ہوجائے گی .....

منی بائی کا ایک خط اور روزنامچہ میں ایسا موجود ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا داغ ان پر حیدر آباد کے چلے آنے کے لئے برابر زور ڈالتے رہے اور ہر خط میں انھیں مجبور کرتے رہے کہ وہ جیسے بنے حیدر آباد چلی آئیں، لیکن منی بائی بعض وجوہ کی بنا پر ان کے حکم کی تعمیل میں معذور تھیں، اور مرزا صاحب کی ہر ممکن تسلی و تشفی کر رہی تھیں، اصل خط ملاحظہ فرمائیے:۔

حاجی صاحب! السلام علیکم

بعد شوق ملاقات عرض پرداز ہوں کہ آپ کا محبت سے لبریز خط ملا، آپ بلائیں اور میں نہ آؤں، میری کہاں مجال اور مجھ میں کہاں اتنی طاقت کہ غلط عذر کرسکوں، مگر بعض مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان جو چاہتا ہے وہ نہیں کرسکتا، میں لاکھ چاہتی ہوں کہ مجھے یہاں کے جھمیلوں سے نجات ملے اور میرے پر لگ جائیں اور آپ تک پہونچ لوں مگر ان مجبوریوں کا خدا بھلا کرے کہ وہ میری روانگی میں حایل ہیں کہ کچھ کرتے دھرتے بن نہیں پڑتی، آپ ہیں کہ برابر مجھے بے مروتی اور بے رخی کے طعن و تشنیع سے چلنی کئے ڈالتے ہیں، میرے ہر عذر کو بہانا خیال کرکے شک کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں، واقعات جو ہیں وہ من وعن میں خود اور حکیم صاحب آپ کو لکھ چکے ہیں، میں ان کا بار بار کیا ذکر کروں، آپ کی عقل کہاں گئی ہے، آپ کی ہوش مندی کدھر سو رہی ہے سوچ سمجھ کر سند کی جاتی ہے، اچھا صبر سے کام لیں وہ وقت آیا ہی چاہتا ہے کہ آپ میرے اور میں آپ کے سامنے ہوں گی۔

آج دو روز سے مجھے زکام شدید ہوگیا ہے، ناک بُری طرح بہتی ہے یہ خط مشکل سے لکھ پایا ہے، یقین ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ یہ کیا لکھ دیا کرتے ہیں کہ بجز "غم فراق" سب خیریت ہے، مجھے آپ نے ایک دفعہ بھی نہیں لکھا، یہ دردِ نقرس کے بار بار دورے کیا معنی رکھتے ہیں۔ حکیم صاحب والے خط سے مجھے معلوم ہوا، خدا کرے آپ اب بالکل صحیح ہوں

یہاں سب خیریت ہے پرسانِ حال سلام عرض کرتے ہیں ۔۔۔۔۔۔

ایک عرصہ تک داغ و حجاب کے مابین اسی نوع کی پرلطف و دلچسپ خط و کتابت رہی، اس عشق و محبت کے تحت مرزا داغ پر کیا گزرتی تھی اس کا کافی ذکر اُس روزنامچہ میں موجود ہے جس کا ایک اقتباس آپ نے اوپر ملاحظہ فرمایا۔ بی حجاب کا ایک خط آیا جس میں اپنے حیدرآباد آنے کے باب میں کچھ تکلف فرمایا تھا اور عاشقانہ راز و نیاز کے تحت بہت کچھ لکھا تھا، دیکھئے داغ اس کا کیا اثر لیتے ہیں، روزنامچہ کا ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے

"آج مرزا صاحب نے مجھ سے متعدد خطوط لکھوائے، سات آٹھ خط لکھوانے کے بعد بولے کہ ایک خط اور لکھانا تھا، پھر کچھ سوچ کر بولے اچھا تم ہی لکھو خط منی بائی حجاب کو لکھایا جو یہ تھا:۔

دشمنِ جانی، سلام شوق

عین انتظار میں تمھارا محبت نامہ ملا، کئی بار پڑھا، آنکھوں سے لگایا، چوما، چھاتی پر دھرا رہا، تم لکھتی ہو کہ مجھے بھول جاؤ اور اگر نہ بھولو تو بدل جاؤ، یہ کرلوگے جب ہی تمھارے پاس آؤں گی، خوب تم کو بھول جاؤں گے

تو بھولنے[1] کی چیز نہیں خوب یاد رکھ
نادان کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

اچھا تم یہاں آجاؤ، پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو بھولنے کی کوشش کریں گے، مجھے تمھاری ہر بات منظور ہے، جواب میں لکھو کب آرہی ہو۔

باوجود صدیا وعدوں کے مرزا صاحب حجاب کے باب میں ہمیشہ کچھ متردد اور مشکوک سے رہا کرتے تھے اور اپنے بے تکلف احباب سے اکثر پوچھا کرتے تھے کہ کیا واقعی حجاب اپنا وعدہ پورا کریں گی اور حیدرآباد آجائیں گی، مولانا احسن مارہروی روزنامچہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

منی بائی حجاب جن کی جلوہ نمائی مثنوی فریادِ داغ کے پردے میں پھیلی ہوئی ہے، ایک مدتِ مدید کے بعد حیدرآباد آنے والی ہیں، مرزا صاحب ۲۵۔۳۰ برس سے مختلف تدبیریں ان سے ملنے کی کر رہے تھے اب بشرائط چندروہ ان کے پاس آنے پر رضامند ہوئی ہیں پھر بھی مرزا صاحب کو والہانہ شبہات سے تھوڑی بہت بے اطمینانی باقی ہے، کل دیوانِ حافظ سے فال نکالی گئی کہ حجاب کلکتہ سے حیدرآباد آئیں گی یا نہیں مغرب کی نماز پڑھ چکے تھے خاص خاص بے تکلف احباب و شاگرد جمع تھے حکم ہوا کہ دیوانِ حافظ لاؤ، دیوان لایا گیا مجھ سے بولے احسن تم سید ہو اور حافظ ہو فاتحہ پڑھ کر خواجہ کی روح کو ثواب پہونچاؤ اور کتاب کھولو، میں نے تعمیلِ حکم کی کھولتے ہی پہلا شعر یہ نکلا ؎

در کارِ گلاب و گل حکمِ ازلی این بود
کاں شاہدِ بازاری دیں پردہ نشیں باشد

لسان الغیب کی اس عقدہ کشائی نے مرزا صاحب کو بے حد مسرور کیا، ایسی صریح صراحت کے بعد کسی اور شگون کے لینے کی ضرورت نہیں تھی مگر مشتاق و بے صبر عاشق مزاج طبیعت کو اطمینان کہاں، رمّالی کے پانسے پھینکے گئے اور ہاتھوں کو گھما کر پانسوں کو سطح پر پھینکا گیا حساب لگایا تو یہ جواب تھا۔

"حجاب آنے کو ہیں مگر روپیہ نہیں"

---

[1] مرزا صاحب کی اس شعر پر غزل بھی ہے اور اس میں یہ شعر مقطع کر دیا ہے ؎

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ
اے داغ کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

الغرض ان تمام مشکلات پر عبور ہوا اور بی حجاب حیدر آباد وارد ہوئیں، ان کے ورود کا حال بھی سنئے:۔

منی بائی آج چار روز ہوئے کلکتہ سے تشریف لے آئی ہیں ایک طوائف کی ایسی دنیا بدلی ہے کہ کوئی وقت وظیفے سے خالی نہیں، تحقیق سے معلوم ہوا کہ صوم وصلوٰۃ کی پابندی پانچ چھ برس سے ان کی گھٹی میں پڑ گئی ہے، ہر سال رجب سے رمضان تک مسلسل روزے رکھتی ہیں اُن کی اس حالت کو دیکھ کر مرزا صاحب فرمارہے تھے کہ دو چار برس میں ولیہ ہو جائیں گی۔

منی بائی حجاب حیدر آباد وارد ہوئیں تو جو سب سے پہلی چیز ان کو پیش کی گئی وہ ایک جاء نماز اور تسبیح تھی، جس روز سے منی بائی حجاب تشریف لائی ہیں مرزا صاحب کی زبان پر ان کے زہد کا ذکر ہے، آج فرمارہے تھے میرے گھر میں فرشتن آئی ہیں، آسمان پر شور مچا ہوا ہے، اللہ میاں کے پاس فرشتے فریاد لے کر گئے کہ آمیوں میں اے خدا تو نے عبادت کی ایسی طاقت کب دی تھی پھر کیا وجہ ہے کہ داغ کے گھر میں ایک ایسی عورت آئی ہے جو ہم سے بہت سبقت لے گئی ہے، مرزا صاحب اس ضمن میں یہ بھی بولے کہ میں نے بی حجاب سے کہدیا ہے کہ نماز کے سوا جب تک تمہارے وظیفے نہیں چھوٹیں گے اس وقت تک تم انسان نہیں بن سکتیں اور جب انسان نہیں بن سکتیں اُس وقت تک میرے کام کی نہیں ہو سکتیں، بہر حال تم یاد رکھو رفتہ رفتہ تمہارے سب وظیفے چھڑا دونگا، اور تم کو خالی نماز پر اکتفا کرنی ہوگی۔

اسی زمانہ میں مرزا داغ نے قاضی عبدالحمید صاحب کو کلکتہ ایک خط لکھا، وہ بھی ملاحظہ فرمایئے:۔

جناب قاضی صاحب مصدر عنایت کرم سلمہ اللہ تعالےٰ۔

سلام مسنون کے بعد دعا نگار ہوں کہ آپ کا محبت نامہ پہونچا جس میں ایک دعائیہ شعر بھی تھا، بی فرشتن صاحبہ معہ بابو خدا بخش کے پہونچیں میرا مکان بھی آسمان ہے بی فرشتن کا نزول ہے، میں رندِ خرابا تی اور وہ زاہد مناجاتی، دیکھئے کیا ہو، ابھی مجھے اس پردے میں نہیں معلوم ہوا کہ وہی ہیں یا کوئی اور۔۔۔۔۔۔

مُنّی بائی حجاب کئی سال حیدر آباد رہیں اور مرزا صاحب ان سے دل بہلاتے رہے، وہ درحقیقت چاہتی تھیں کہ مرزا صاحب ان سے نکاح فرمالیں شروع میں مرزا صاحب کا ارادہ بھی ہوا لیکن بوجوہ انھیں اپنا یہ خیال ترک کرنا پڑا، ان تمام واقعات سے متعلق مفصل و مشرح یادداشتیں روزنامچے میں موجود ہیں جن سے صرف ایک یادداشت پیش کرتا ہوں، جس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ بی حجاب کی محبت و اُلفت کے اُس جذبہ نے جو عرصہ ہوا رام پور میں پیدا ہوا تھا اور جس نے اس دوران میں مختلف رنگ اختیار کئے تھے، محبت و تعلق کی انتہا پر پہونچکر اُس سرد مہری و بے کیفی پر ٹھوکر کھائی جو ایسے بازاری عشق و محبت کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے، مولانا احسن مارہروی کے ترتیب دئے ہوئے روزنامچہ میں جہاں صدہا یادداشتیں بی حجاب کی محبت و اُلفت کی یادگار ہیں وہیں کچھ اسناد ایسی بھی ملتی ہیں جن کو پڑھ کر اس دیرینہ محبت کی مکمل پسپائی کا بھی آپ اندازہ کر سکیں گے، چنانچہ ملاحظہ کیجئے:۔

آج دو روز سے مرزا صاحب بہت سست اور بجھے بجھے سے نظر آتے ہیں، وہ شگفتگی و خنداں پیشانی مفقود ہے جو مرزا صاحب کی فطرتِ ثانیہ ہے، وجہ افسردگی اس کے سوا دوسری نہیں کہ بی حجاب سے کچھ ان بن ہوگئی ہے، دن کا زیادہ وقت گھر میں بسر کرنے کی بجائے باہر گزرتا ہے، آج دوپہر کا کھانا بھی مرزا صاحب نے باہر ہی کھایا، شام کو بی حجاب نے بلایا تو برجستہ یہ شعر فرمایا اور مجھ سے ایک کاغذ کے پرزے پر لکھوا کر بھجوا دیا ؎

در پردہ تم جلاؤ جلاؤں نہ میں چہ خوش
میرا بھی نام داغ ہے گر تم حجاب ہو

مرزا صاحب کی اب ایسی عمر نہیں کہ وہ عاشقانہ غمزوں اور نخروں کے متحمل ہو سکیں، سب جوانی دیوانی کے کرشمے ہوتے ہیں کہ انسان بڑی بڑی کڑی جھیل جاتا ہے، بی حجاب باوجودیکہ خود بھی عمر رفتہ کی یادگار رہ گئی ہیں لیکن اس کا احساس نہیں اور ناز و غمزہ سے پہلو تہی نہیں فرماتیں، اپنی اور مرزا صاحب کی عمر کا لحاظ کر کے ان کو شوخ غمزوں سے گریز کرنا چاہئے

لیکن برخلاف اس کے آئے دن وہ شکر رنجی کا کوئی نہ کوئی پہلو اختیار کرلیتی ہیں جس کا اثر مرزا صاحب پر کئی کئی دن رہتا ہے .....

یہ شکر رنجی سے متعلق بالکل ابتدائی یادداشتیں ہیں، نوبت بالآخر یہاں تک پہونچی کہ حجاب کو دوسرے مکان میں اٹھ جانا پڑا اور وہ ایک عرصہ تک مرزا صاحب سے گزارہ پاتی رہیں اور ناخوش و نامراد دوسرے مکان میں مقیم رہیں، مرزا صاحب سے تعلقات رہے لیکن اکھڑے اکھڑے، اس سلسلہ کی تمام یادداشتیں بڑی دلچسپ ہیں جس کا ذکر میں پھر کروں گا۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

میرؔ کا شعر نہیں ہے۔

۵۴ء کے کسی مہینہ میں میرے ایک دوست نے یہ شعر سنایا تھا، چونکہ اس میں تخلص موجود تھا اور اس کا اندازِ بیان بھی کلاسکی قسم کا تھا اس لئے خیال پیدا ہوا کہ یہ شعر ممکن ہے میر تقی میرؔ کا ہو، گو اندازِ بیان ضرور میرؔ کے رنگ سے کچھ ہٹا ہوا تھا۔

میں نے کلیاتِ میرؔ اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس زمین میں میرؔ نے کوئی غزل نہیں کہی۔ لیکن چونکہ یہ شعر مجھے پسند تھا، اس لئے میں نے اس طرح پر قارئین نگار سے غزلیں طلب کیں، اور اس کا اعلان دسمبر ۵۴ء میں کر دیا۔ میرے اعلان کے الفاظ یہ تھے :-

"کہا جاتا ہے کہ یہ شعر میرؔ کا ہے لیکن اس کے کلیات میں میری نظر سے نہیں گزرا، بہرحال یہ شعر میرؔ کا ہو یا کسی اور کا نہایت پاکیزہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس زمین میں چند اچھی غزلیں نگار کو ملجائیں"

اس اعلان پر متعدد احباب نے طبع آزمائی کی اور جو غزلیں موصول ہوئیں، ان کا انتخاب شایع کر دیا گیا لیکن یہ خلش بدستور باقی رہی کہ یہ شعر میرؔ کا نہیں تو پھر کس کا ہے۔

ایک زمانہ کے بعد جناب رازؔ یزدانی رامپوری نے مجھے لکھا کہ یہ شعر فکرؔ رام پوری کا ہے جسے انھوں نے کلیر کے مشاعرہ میں پڑھا تھا ——— حافظ سہارنپوری نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ یہ شعر میرؔ کا ہے اور انھوں نے نگار کا حوالہ دیدیا۔

یہ حوالہ یقیناً درست تھا لیکن ناتمام۔ حافظ سہارنپوری کو چاہئے تھا کہ وہ میرے اعلان کے تمام الفاظ کو سامنے رکھ کر اعتراض کرتے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

بہرحال اب جناب رازؔ یزدانی کی عنایت سے یہ معمہ حل ہوگیا اور میں حضرت فکرؔ رامپوری کا حد درجہ شکر گزار ہوں کہ ان کے اس پاکیزہ شعر کی وجہ سے نہ صرف بزمِ نگار میں بلکہ اس سے باہر بھی عرصہ تک ہلچل مچی رہی۔

(نیاز)

"نگار" کے بعض سالنامے رعایتی قیمت پر

پاکستان یا جوبلی نمبر ——— فرمانروایانِ اسلام نمبر ——— علوم اسلامی نمبر ——— مستقبل کی تلاش نمبر ——— میزان

ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف آٹھ روپیہ میں مل سکتے ہیں

منیجر نگار لکھنؤ

شعراور نفسیاتی مطالعہ

ایک نیا تجربہ

(اڈیٹر)

غزل گوئی آجکل جس دور سے گزر رہی ہے، اس کی اہمیت سے انکار نہیں ۔ نئے رجحانات، نئے مطالب، نئے اسالیب بیان، نئے استعارات نئی تعبیرات - الغرض ہر چیز نئی۔ لیکن اس "ہنگامۂ تجدد" میں مجھے وہ چیز بہت کم نظر آتی ہے جسے "دل کی ہوک" اور "درد کی کسک" کہتے ہیں معلوم نہیں یہ چیز اب پیدا ہی نہیں ہوتی یا یہ کہ شکست خوردہ ذہنیت سمجھ کر اس کا اظہار مناسب نہیں سمجھا جاتا - بہرحال سبب جو کچھ بھی ہو، ہے یہ حقیقت اور بڑی تلخ حقیقت ـــــ!

غزل میں یہ کیفیت پیدا کرنا مشکل بھی ہے اور آسان بھی - مشکل اُس وقت جب ہم خواہ مخواہ شعر کہنے پر اپنی طبیعت کو مجبور کریں اور آسان اس وقت جب طبیعت خود ہمیں مجبور کرے - اس میں شک نہیں کہ "دل پر کیا گزرتی ہے" ـــ اس کا اظہار تو اسی وقت ہوسکتا ہے جب ہمارے دل پر گزرے، لیکن "کیا گزر سکتی ہے" اس کا بیان بھی کم دلچسپ نہیں ـــ اور سچ پوچھئے تو اکثر کلاسکل شعراء کا سرمایۂ غزل کچھ ایسا ہی تھا - یعنی ان میں سبھی تو محبت نہیں کی تھی لیکن کم از کم وہ یہ ضرور جانتے تھے کہ محبت کی باتیں کیسی کی جاتی ہیں اور اس مقصد کے لئے انھوں نے اپنے لئے کچھ آسانیاں بھی پیدا کرلی تھیں، یعنی وہ جذبات محبت کے اظہار کے لئے ہمیشہ وہی بحریں اختیار کرتے تھے جو غزل کی صحیح روح کی متحمل ہوسکتی ہیں اور جو ذہن شاعر میں ترنم کی کیفیت پیدا کردیتی ہیں -

کچھ دنوں سے میں اس مسئلہ پر غور کر رہا تھا کہ ایک اور سوال میرے سامنے آیا وہ یہ کہ جب صداقت ہر جگہ ایک ہے، تو پھر اس کے اظہار کے لئے مختلف لوگ کیوں مختلف لب و لہجہ اور مختلف اندازِ بیان اختیار کرتے ہیں ؟ کوئی اسے شکوہ و شکایت کی صورت میں ظاہر کرتا ہے، کوئی طنز و تشنیع کا انداز اختیار کرتا ہے، کوئی تشبیہ و استعارہ سے کام لینا چاہتا ہے اور کوئی نہایت سادگی سے سادہ الفاظ میں اسے ظاہر کردیتا ہے ـــ ظاہر ہے کہ اس کا سبب احساس و تعقل کا اختلاف نہیں بلکہ ذہن و دماغ کی ان راہوں کا اختلاف ہے جو فطری افتاد، ماحول کے تقاضے اور تربیت و تجربات کے زیر اثر ذہنِ انسانی میں مرتسم ہوجاتی ہیں اور ہمارا خیال انھیں راہوں سے گزر کر زبان تک پہونچتا ہے - اس لئے میں نے سوچا کہ اگر ان مختلف اسالیب بیان کو سامنے رکھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اندازِ بیان کو دیکھ کر شاعر کا نفسیاتی مطالعہ نہ کرسکیں اور اس کا تجربہ یقیناً بڑی دلچسپ چیز ہوگا -

اس تجربہ کی آسان صورت تو یہ ہوسکتی تھی کہ اساتذہ کے کلام کو سامنے رکھ کر ان کی نفسیات پر روشنی ڈالی جاتی، لیکن مجھے یہ بات زیادہ دلچسپ نظر نہ آئی اس لئے میں نے خیال کیا کہ اگر موجودہ دور کے شعراء اس تجربہ میں میرا ساتھ دینے پر آمادہ ہوجائیں تو صورت زیادہ دلچسپ ہوجائے گی اور اس طرح ان کے اور نگار کے درمیان ایک نہایت لطیف حریفانہ رشتہ بھی قایم ہوجائے گا -

ہوسکتا تھا - میں ان کے مطبوعہ کلام کو سامنے رکھ کر اس تجربہ کا آغاز کرتا، لیکن اس سے میرا مقصد پورا نہ ہوتا - اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ ایک ہی زمین میں ایک ہی آسان طرح پر سب کو دعوتِ فکر دی جائے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ ایک ہی جذبہ کے اظہار میں مختلف شعراء نے کن اسالیب بیان کو اختیار کیا ہے اور پھر اس سلسلہ میں ان کے نفسیاتی رجحان پر غور کیا جائے اگر وہ اس کی اجازت دیں -

یہ بات طے کرنے کے بعد میں نے مصرع طرح پر غور کرنا شروع کیا اور اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ صحیح تغزل پیدا کرنے کے لئے بحر کا مترنم ہونا ضروری ہے، میں نے بحر رمل کا انتخاب کیا اور ردیف و قوافی کی وسعت کے لحاظ سے غالب کی ایک زمین پسند کی جو بڑے امکانات تغزل اپنے اندر رکھتی ہے،

یعنی :- میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

"جائے ہے" اور "آئے ہے" اب متروک ہے، لیکن یہ انھیں متروکات میں سے ہے جنھیں وسعتِ بیان کی رعایت سے ہمیں پھر اختیار کرلینا چاہئے۔

اس زمین میں، مومن و غالب دونوں نے فکر کی ہے، مومن کی غزل پندرہ اشعار کی ہے جس میں پانچ قطعاً قابلِ ذکر نہیں :-

رشکِ دشمن نے بنا دی جان پر اے بیوفا — کب تلک کوئی نہ بگڑے حال بگڑا جائے ہے
تحکامِ عشق شیریں لب جئے تو کیا ہوا — شور بختی سے مزہ ہی زندگی کا جائے ہے
حسن روز افزوں پہ غرہ کس لئے اے ماہرو — یونہی گھٹتا جائے گا جتنا کہ بڑھتا جائے ہے
پونچھے آنسو وارثوں کے کیا کروں اب ہائے ہائے — داغ میرے خون کا دامن سے چھوٹا جائے ہے
رو رہا ہوں خندۂ دنداں نما کی یاد میں — آبِ گوہر کے لئے آنکھوں سے دریا جائے ہے

اسی طرح غالب کی دس شعروں کی غزل میں تین شعر نظری قرار دئے جانے کے قابل ہیں :-

دورِ چشمِ بد تری، بزمِ طرب سے واہ واہ — نغمہ ہو جاتا ہے واں گر میرا نالہ جائے ہے
اس کی بزم آرائیاں سنکر دلِ رنجوریاں — مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے
نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں — کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

غالب کے مقطع کا دوسرا مصرع یقیناً بہت صاف ہے، لیکن پہلا مصرع اس زمین کی روح کے منافی ہے :-

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسد — پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

اسی زمین میں مومن و غالب کے بہترین اشعار ملاحظہ ہوں :-

مومن :- ۱- ہے نگاہِ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے — یہ ستم اے بیمروت کس سے دیکھا جائے ہے
۲- جاں نہ کھا وصلِ عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں — جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے
۳- غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں — کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے

غالب :- ۱- دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے — میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
۲- ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے — آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے
۳- شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائے ہے — دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے
۴- گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق — پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

غالب کے یہ چاروں شعر بہت اچھے ہیں لیکن تغزل کی جو صحیح روح مومن کے شعروں میں پائی جاتی ہے وہ چوتھے شعر کو چھوڑ کر غالب کے کسی شعر میں نہیں ہے۔

غالب و مومن کے اچھے بُرے اشعار کی صراحت اس لئے ضروری تھی کہ آپ یہ معلوم کرسکیں میں کس رنگ کے اشعار اس زمین میں چاہتا ہوں۔ زمین بہت شگفتہ ہے، قافیوں کی کوئی انتہا نہیں اور پوری آزادی کے ساتھ اس میں فکر کی جاسکتی ہے، لیکن میں یہی چاہتا ہوں کہ آپ فکر کرنے سے پہلے اپنے آپ کو میر و درد کی فضا میں لے جائیں اور صرف وہی لکھیں جو تکلف و تصنع اور ایہام و رعایتِ لفظی سے بالکل پاک ہو۔

ان غزلوں کے موصول ہونے پر میں تمام مشترک قافیوں کو سامنے رکھ کر غور کروں گا اور پھر ہر قافیہ کے بہترین اشعار کو سامنے رکھ کر اس نفسیاتی رجحان کے معلوم کرنے کی بھی کوشش کروں گا جس کے زیرِ اثر وہ کہے گئے ہیں۔

تحریر اور سوادِ خط دیکھ کر مطالعۂ کردار قدیم فن ہے، لیکن اشعار پڑھ کر کسی شاعر کی نفسیات کا مطالعہ غالباً اس سے زیادہ دلچسپ بات ہوگی

ایک بات اور عرض کردوں جس کا تعلق فن سے ہے - وہ یہ کہ متروک الفاظ میں مت - "تلک - پہ - پر (بہ معنی لیکن) - سو - بالے - گر (اگر کی جگہ) - جوں (بہ معنی مانند) - مگر (بہ معنی شاید) یاں - واں - آپ آزادی سے استعمال کر سکتے ہیں۔ البتہ کسی حرف کا تقطیع سے گرنا مناسب نہ ہوگا - بعض حضرات ع کو بھی الف قرار دے کر تقطیع سے گرا دیتے ہیں، یہ نہ ہونا چاہئے، اسی طرح یوں، کیوں وغیرہ کو بھی دبکر نہ نکلنا چاہئے

ہاں، ایک بات اور - وہ یہ کہ مصرع طرح "بحر رمل مثمن محذوف" کا ہے (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) لیکن پہلا مصرع آپ[1] محذوف و مقصور دونوں میں موزوں کر سکتے ہیں - فرق صرف یہ ہے کہ محذوف میں آخری رکن بروزن فاعلن آئے گا اور مقصور میں بروزن فاعلات لیکن اس کا اثر ترنم و ایقاع پر نہیں پڑے گا۔

ازراہِ کرم اپنی غزل اپنے ہی دست و قلم سے لکھ کر بھیجئے اور اسی سوادِ خط میں جو آپ کا معمول ہے، خوشخطی یا بنا بنا کر لکھنے کی ضرورت نہیں۔

اگر غزلیں زیادہ سے زیادہ آپ ۸ اپریل تک بھیج سکیں تو بڑا کرم ہوتا کہ مئی میں ان کی اشاعت ہو سکے۔

---

[1] مثلاً غالب کا یہ مصرع :- سایہ میرا مجھ سے مثل دود بھاگے ہے اسد

محذوف میں ہے لیکن اگر یہ مصرعہ امیر کا ہوتا اور وہ بجائے اسد کے امیر لکھتے تو مقصور ہو جاتا۔

"نگار" کے پچھلے فائل

سنہ ۳۲ء	=	جولائی تا دسمبر	=	——— = ۸؍
سنہ ۳۶ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ ہندی شاعری نمبر) = ۱۵؍
سنہ ۳۷ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ اصحابِ کہف و خلافت نمبر) = ۱۵؍
سنہ ۳۹ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ مصحفی نمبر) = ۱۵؍
سنہ ۴۰ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ نظیر نمبر) = ۱۵؍
سنہ ۴۴ء	=	جولائی تا دسمبر	=	——— = ۸؍
سنہ ۴۶ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ انتقاد نمبر) = ۱۵؍
سنہ ۴۷ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ ماجد و لین نمبر) = ۱۵؍
سنہ ۴۹ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ افسانہ نمبر) = ۱۵؍
سنہ ۵۰ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ تنقید نمبر) = ۱۵؍
سنہ ۵۲ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ حسرت نمبر) = ۱۵؍
سنہ ۵۳ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ داغ نمبر) = ۱۵؍

نوٹ :- صرف ایک ایک فائل موجود ہے اور سب سے پہلے جس کا آرڈر پہونچے گا اسی کو دیا جائے گا - قیمت محصول ڈاک کے علاوہ ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

مشکلات غالب

بہ سلسلۂ دسمبر ۱۹۵۶ء

(یہ سلسلہ جولائی ۱۹۵۶ء سے شروع ہوا تھا جو دسمبر ۱۹۵۶ء تک جاری رہا۔ اب سالنامہ کی اشاعت کے بعد مارچ ۱۹۵۷ء سے پھر اسے شروع کیا جاتا ہے اور غالباً دسمبر ۱۹۵۷ء تک جاری رہے گا[1])

غزل (۱۴۱)

۱- گر خامشی سے فایدہ اخفاءِ حال ہے خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

اگر لوگ اپنی خاموشی سے یہ فایدہ اٹھاتے ہیں کہ ان کا حال کسی پر ظاہر نہیں ہوتا، تو میں بھی اپنی گویائی سے خوش ہوں کیونکہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ بھی لوگ نہیں سمجھ سکتے، یعنی جو فایدہ دوسرے لوگ خاموشی سے حاصل کرتے ہیں وہ میں اپنی گویائی سے حاصل کرتا ہوں، گویا اوروں کی خاموشی اور میری گویائی بہ لحاظ نتیجہ دونوں ایک ہی سی ہیں۔ اس میں غالب نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میری شاعرانہ بلند خیالی تک مشکل ہی کوئی شخص پہونچ سکتا ہے۔

۲- کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ دل فردِ جمع و خرچ زبانہائے لال ہے

"فردِ جمع و خرچ" اس کاغذ کو کہتے ہیں جس میں جمع و خرچ کا حساب درج ہوتا ہے یعنی بہی کھاتا، یہاں مراد محض دفتر یا ریکارڈ ہے۔

"زبانہائے لال" = گونگی زبانیں۔

اس شعر کا مفہوم واضح نہیں۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ میں حسرتِ اظہار کا گلہ کس سے کروں جبکہ خود میرا ہی دل اظہار حال سے قاصر ہے۔ اس صورت میں "زبانہائے لال" سے خود غالب کی گنگ زبانی مراد ہوگی۔ لیکن اگر "زبانہائے لال" کا تعلق دوسروں سے ہو تو پھر مفہوم یہ ہوگا کہ جب لوگ میرا حال پوچھتے ہی نہیں تو پھر میں حسرتِ اظہار کا گلہ کس سے کروں۔ زیادہ قرینِ قیاس یہی مفہوم ہے۔ گو اس صورت میں "زبانہائے لال" بہ صورت جمع استعمال کرنے کا کوئی محل نہیں ہے۔

۳- کس پردہ میں ہے آئینہ پردازِ لے خدا رحمت، کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے

آئینہ پرداز = محوِ آرایش۔ رحمت کے بعد لفظ کہ محذوف ہے۔

شاعر خدا کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تو کس پردہ میں محوِ آرایش ہے سامنے آ اور اس کا انتظار نہ کر کہ میں عذرِ گناہ پیش کروں

---

[1] جو حضرات جولائی ۱۹۵۶ء سے دسمبر ۱۹۵۶ء تک کے تمام پرچے چاہتے ہوں وہ منیجر نگار سے خط و کتابت کریں۔

کیونکہ میرا لبِ بے سوال (یعنی میرا کچھ نہ کہنا) ہی میری بڑی معذرت ہے جس پر تجھے رحم کرنا چاہئے۔ مدعا یہ کہ جو کچھ دینا ہے بے طلب دے، سوال کا انتظار نہ کر۔

۴۔ ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی! اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

دوسرے مصرع میں "شوق منفعل" غور طلب ہے، اگر یہ ترکیب توصیفی ہو اور منفعل کو شوق کی صفت قرار دیا جائے تو پھر پہلا مصرعہ بے معنی سا ہو جاتا ہے، کیونکہ جب شوق خود محبوب کے خیال دشمنی پر منفعل ہے تو پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے کہ "ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی!" اس لئے اگر شوق اور منفعل دونوں کو علٰحدہ علٰحدہ رکھ کر منفعل کے بعد لفظ ہو محذوف تسلیم کیا جائے تو البتہ پہلا مصرعہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ اور اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ اے شوق تیرا یہ خیال کہ محبوب تیرا دشمن ہے صحیح نہیں اور اس پر تجھے منفعل (شرمندہ) ہونا چاہئے۔ ہو سکتا ہے دوسرا مصرع یوں ہو:۔ "اے شوق منفعل ہو، تجھے کیا خیال ہے"

۵۔ مشکیں لباس کعبہ، علی کے قدم سے جان نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

"مشکیں لباس" سے سیاہ لباس نہیں، بلکہ مشک کی سی خوشبو دینے والا لباس مراد ہے۔ نافِ زمین سے مراد مرکزِ زمین ہے اور کہا جاتا ہے کہ کعبہ نافِ زمین ہے۔

نافِ غزال = ہرن کی ناف جس کے اندر مشک پیدا ہوتا ہے۔

مفہوم یہ کہ کعبہ کے لباس سے اگر مشک کی سی خوشبو آتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علی وہاں پیدا ہوئے تھے، ورنہ کعبہ گو نافِ زمین سہی مگر نافِ غزال تو نہیں کہ اس سے مشک کی خوشبو پیدا ہو۔

۶۔ وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ ہے دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

"عرصۂ آفاق" سے مراد "عرصۂ زمین" ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ زمین کی وسعت میری وحشت و صحرانوردی کے لئے اتنی تنگ تھی کہ زمین کو اس سے شرم آئی اور وہ پسینہ پسینہ ہو گئی ۔ اور سمندر جس چیز کا نام ہے وہ بھی عرقِ انفعال ہے۔

۷۔ ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ دُنیا تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

غالب اپنے آپ سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہستی یا عالم موجودات کے فریب میں نہ آجانا، یہ سراسر وہم و خیال ہے، ان کا وجود بظاہر کہیں نہیں ہے یا ہو تو نہ ہونے کے برابر ہے۔

(غزل نمبر ۱۴۲ صاف ہے)

غزل (۱۴۳)

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

غلط بردار کاغذ وہ جس سے کوئی حرف بہ آسانی مٹایا جا سکے، لیکن یہاں خود کاغذ کو اس معنی میں غلط بردار کہا گیا ہے کہ وہ خود حرف غلط کو مٹا دیتا ہے۔

چونکہ محبوب نے اپنے خط میں کسی جگہ غلطی سے حرفِ وفا لکھ دیا تھا، اس لئے وہ آپ ہی کاغذ سے مٹ گیا اور عاشق کو اس کی تردید کی ضرورت بھی نہیں ہوئی۔

۲۔ جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتشبار ہے

ہم چاہتے تو یہ ہیں کہ کسی طرح یک دم جل کر فنا ہو جائیں لیکن باوجود اس کے کہ ہماری ہر سانس آتش بار ہے، ہم جل نہیں چکتے اور اس طرح ذوقِ فنا کے پورے نہ ہو سکنے پر ہمارا جی ہر وقت جلتا رہتا ہے۔

۴۔ ہے وہی بدمستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ جس کے جلوہ سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

"عذر خواہ" کے معنی یہاں معذور سمجھنے والا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ جس کے جلوہ سے زمیں تا آسمان مست و سرشار ہے، وہ جانتا ہے کہ یہاں ہر ہر ذرہ ذرہ کو مست و سرشار ہونا چاہئے

۵۔ مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

غالب نے یہ شعر بالکل مومن کے رنگ میں کہا ہے اور بہت خوب ہے۔

معشوق غالب سے کہتا ہے کہ "تو وہی ہے نا جو ہمیں اپنی زندگی کہا کرتا تھا، پھر آج کیوں اس قدر خفا ہے"، یہ سن کر غالب نے کہا کہ خدارا ایسی بات منھ سے نہ نکال، کیونکہ آج کل میں زندگی سے بھی بیزار ہوں اور تجھ سے بیزاری مجھے کسی طرح گوارا نہیں۔

(غزل نمبر (۱۴۴) صاف ہے)

غزل (۱۴۵)

۱۔ مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے جسے کہتے ہیں نالہ وہ اس عالم کا عنقا ہے

مفہوم یہ ہے کہ تمناؤں کے ہجوم نے مجھے حیرت کدہ بنا دیا ہے اور عالمِ حیرت میں انسان خاموش رہتا ہے اس لئے نالہ و فریاد کا کیا ذکر نالہ و فریاد کو عالمِ حیرت کا عنقا کہنا اس بنا پر ہے کہ عنقا کا بس نام ہی نام ہے، بظاہر کہیں اس کا وجود نہیں پایا جاتا۔

۴۔ نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

جب انسان مایوس ہوتا ہے تو کفِ افسوس ملتا ہے اور جب باہم عہد و پیمان ہوتا ہے تو بھی ہاتھ سے ہاتھ ملایا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ میں عالمِ یاس میں کفِ افسوس ضرور ملتا ہوں، لیکن چونکہ ناامیدی و یاس کی تکلیف میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے اس لئے میں اپنے دل کو سمجھاتا ہوں کہ میرا کفِ افسوس ملنا ناامیدی کی بنا پر ضرور ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ تجدیدِ تمنا کا عہد و پیمان بھی ہو

غزل (۱۴۶)

۱- رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے

بود (ہستی) - چراغ کشتہ (بجھا ہوا چراغ) - دُود (دھواں)

غالب نے "چراغ کشتہ" عنقریب بجھ جانے والے چراغ کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ بجھے ہوئے چراغ کے مفہوم میں نہیں ورنہ "طلبِ رحم" کا فقرہ بیکار ہو جاتا۔

مدعا یہ کہ تیرا بیمارِ وفا اب زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے اور چند گھڑی کا مہمان ہے اس لئے ایسے وقت تو تجھے رحم کرنا ہی چاہئے۔

نبض کو "دودِ چراغِ کشتہ" سے تشبیہ دینا اس بنا پر ہے کہ اطباء آخری وقت کی نبض کو "نبض دودی" کہتے ہیں۔

۲- دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں ورنہ یہ بے رونقی سودِ چراغِ کشتہ ہے

چراغ کا فایدہ اسی میں ہے کہ وہ بجھ جائے (بے رونق ہو جائے) اور اس کا جلنا ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ جب ایک آرزو فنا ہوتی ہے تو دوسری آرزو پیدا کر کے بے چینی پیدا کر لیتے ہیں اور اس چراغ کو بجھنے نہیں دیتے۔

غزل (۱۴۷)

۱- چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

آنکھوں کو نوا پرداز کہنا اس بناء پر ہے کہ باوجود خاموشی کے ان میں ایک کیفیت ضرور ایسی پائی جاتی ہے جیسے وہ کچھ کہہ رہی ہوں لیکن اس خیال کے اظہار کے لئے غالب کی دشوار پسند فطرت نے ایک شعلۂ آواز بھی پیدا کر لیا اور اس شعلہ کے لئے سرمہ کی صورت میں دھواں بھی۔ ورنہ اصل مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ معشوق کی سرمہ آلود آنکھیں باوجود کچھ نہ کہنے کے، بہت کچھ کہہ جاتی ہیں۔

۲- پیکرِ عشاق، سازِ طالعِ ناساز ہے نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

غالب نے اس شعر میں نہایت ناگوار مبالغہ و تعبیر سے کام لیا ہے۔ چونکہ عُشّاق، عاشق کی جمع ہے لیکن ایک فارسی راگنی کا بھی نام ہے اسلئے اس کو سامنے رکھ کر غالب نے ساز بھی پیدا کیا اور "طالعِ ناساز" کی رعایت سے ناموافق سیارہ بھی ڈھونڈھ نکالا اور پھر اپنے نالہ کو اس سیارہ کی آوازِ گردش قرار دیا۔ ورنہ صرف کہنا یہ تھا کہ ہماری آہ و زاری کا سبب صرف ہماری ازلی بدنصیبی ہے اور ہم پیدا ہی اسلئے ہوئے ہیں کہ نالہ و فریاد کرتے رہیں۔

۳- دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

دستگاہ = (قدرت، کمال) — یک بیاباں جلوۂ گل = (ایک وسیع تختۂ گل) — فرشِ پا انداز = (وہ فرش جو کسی کے خیر مقدم کے لئے اس کی راہ میں بچھایا جاتا ہے اور جو عموماً سرخ کپڑے کا ہوتا ہے)

کہنا صرف یہ ہے کہ مجنوں نے اپنی چشمِ خونبار سے سارے دشت کو رنگین بنا دیا ہے، لیکن اس کو ظاہر اس طرح کیا ہے کہ "دشت میں جو وسیع جلوۂ گل نظر آتا ہے وہ مجنوں کی خونبار آنکھوں کا پیدا کیا ہوا ایک فرشِ پا انداز ہے۔

اعتبارات

بات ایک ہی ہے

ایک صبح پہاڑ کی چوٹی پر یزدان و اہرمن کا اجتماع ہوا۔ یزدان نے اہرمن کو مخاطب کرکے کہا: "کیسا مزاج ہے" ... اہرمن نے کوئی جواب نہ دیا۔ یزدان نے کہا: "کیا آج مزاج بہت مکدر ہے"۔ اہرمن نے کہا: "ہاں، میں بہت ملول ہوں کیونکہ اب انسان کا یہ عالم ہے کہ وہ میرے تیرے درمیان کوئی تمیز نہیں کرتا اور اکثر و بیشتر مجھے تیرے ہی نام سے پکارتا ہے۔

یزداں بولا:۔ "اے عزیز من، یہی تکلیف مجھے بھی ہے کہ اب لوگ اکثر مجھے تیرے نام سے پکارتے ہیں"۔

ایک طرف اہرمن افسردگی کے عالم میں چلا گیا اور دوسری طرف یزداں گردن جھکائے ہوئے۔

فکرِ ناکام

تین چیونٹیاں ایک آدمی کی ناک پر چڑھ گئیں جو دھوپ میں پڑا سو رہا تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے کا خیر مقدم کیا۔ ٹھہر کر باتیں کرنے لگیں۔

ایک بولی "آج جس نشیب و فراز کو مجھے طے کرنا پڑا ہے، یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ ہے۔ سارا دن ختم ہو گیا کہ اس دانہ کے طول و عرض کو دریافت کروں لیکن کامیابی نہیں ہوئی"۔

دوسری بولی "میں عرصہ سے اپنے قبیلہ والوں سے سن رہی تھی کہ ٹیڑیوں کے رہنے کی سرزمین بہت پیچ در پیچ ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ آج میں اتفاق سے وہیں پہونچ گئی ہوں"۔

تیسری نے اپنا سر اٹھایا اور بولی کہ ـــــ "اے بہنو، آج ہم ایک بہت بڑی لامتناہی چیونٹی کی ناک پر کھڑے ہوئے ہیں، اس چیونٹی کا جسم تو اتنا بڑا ہے کہ ہماری نگاہیں اس کو دیکھ نہیں سکتیں۔ اس کا سایہ اتنا وسیع ہے کہ ہم اس کی پیمائش نہیں کر سکتے۔ یہی وہ ازلی و ابدی چیونٹی ہے جس کے حدود کا معلوم کرنا ہمارے امکان سے باہر ہے"۔

جس وقت تیسری چیونٹی نے اپنا خطبہ ختم کیا تو ایک نے دوسرے کو دیکھا اور آپس میں ہنسنے لگیں، اتنے میں آدمی نے چونک کر ہاتھ سے اپنی ناک مل دی اور تینوں چیونٹیاں وہیں پس کر رہ گئیں۔

روح کا فیصلہ

ایک دن میں سمندر کی طرف گئی تاکہ وہاں جاکر نہاؤں، جب ساحل پر پہونچی تو میں نے تنہائی کی کوئی جگہ ڈھونڈھنا چاہی تاکہ لوگوں کی نگاہوں سے علیحدہ نہا سکوں۔

میں اسی جستجو میں تھی کہ سامنے کی سیاہ چٹان پر ایک آدمی بیٹھا ہوا دیکھا جو اپنی ہتھیلی سے نمک کی مٹھیاں بھر بھر سمندر

کے اندر پھینک رہا تھا ـــــ میں نے اپنے جی میں کہا - "یہ شاید کوئی سوگوار ذہنیت قسم کا انسان ہے جسے زندگی میں سوا ایک تاریک سایہ کے اور کچھ نظر نہیں آتا - میں اس کے سامنے نہیں نہا سکتی اور مجھے کوئی دوسری جگہ ڈھونڈھنی چاہئے"۔

میں آگے بڑھی تو میں نے دوسری چٹان پر ایک اور شخص دیکھا جس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت صندوقچہ تھا جس سے قند کے ٹکڑے نکال نکال کر وہ سمندر میں ڈال رہا تھا ـــ میں نے اپنے جی میں کہا کہ :- "یہ شاید کوئی متفاول (OPTIMISTIC) انسان ہے جو ایسی چیزوں سے مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے جن میں کوئی مسرت نہیں اس لئے اس کے سامنے اپنا جسم عریاں کرنا مناسب نہیں"۔

کچھ دور آگے چل کے میں نے ایک شخص کو دیکھا جو ساحل سے مچھلیاں چُن چُن کر کمال محبت سے پانی میں پھینک رہا تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا :- "یہ کوئی رحمدل لیکن بیوقوف انسان ہے - صرف زندگی کی تمنا سے موت کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے اس سے بھی دور ہی رہنا اچھا"۔

میں اس کے پاس گزر کر آگے بڑھی - میں نے دیکھا کہ ایک شخص اپنا سایہ پانی کی سطح پر ڈالتا ہے اور جب موجیں اس کو درہم برہم کردیتی ہیں تو پھر وہ دوبارہ اس کی کوشش کرتا ہے - میں نے اپنے دل میں کہا کہ :- "یہ کوئی صوفی ہے جو اپنے وہم کا بُت بناکر اُسے پوجنا چاہتا ہے - اس کے سامنے بھی نہانا مناسب نہیں"۔

آگے بڑھکر ایک اور شخص نظر آیا جو سمندر کا کف لے لیکر ایک کاسۂ عقیق جمع کر رہا تھا - میں نے اپنے جی میں کہا کہ :- "یہ کوئی خیال پرست شخص ہے جو مکڑی کے جالے سے لباس طیار کرنا چاہتا ہے - یہ بھی اس قابل نہیں کہ وہ مجھے عریاں دیکھے"۔

کچھ دور آگے چل کر دفعتہً ایک آواز کان میں آئی کہ "یہی ہے وہ سمندر - یہی ہے وہ عمیق و وسیع سمندر"۔ میں آگے بڑھی کہ دیکھوں یہ آواز کہاں سے آتی ہے - دیکھا کہ ایک شخص ساحل کی طرف پشت کئے بیٹھا ہوا ہے اور اپنے دونوں کانوں پر دو سیپیاں رکھے ہوئے آواز بازگشت کو سُن رہا ہے - میں نے کہا کہ :- "یہ غالباً کوئی دہریہ ہے جو کلیات سے روگردانی کرکے ناکارہ جزئیات کے سمجھنے میں اپنا وقت ضایع کرنا چاہتا ہے"۔

میں اور آگے بڑھی اور دیکھا کہ ایک دُبلا پتلا شخص چٹانوں کے درمیان بیٹھا ہوا، ریت میں اپنا سر چھپائے ہوئے ہے میں نے سوچا کہ یہاں مجھے نہا لینا چاہئے کیونکہ یہ شخص کسی کو نہیں دیکھتا - لیکن کسی نے کہا "ہرگز نہیں یہ کائنات کا بدترین انسان ہے یہ وہ زاہد خشک ہے جو اپنے آپ کو زندگی کی ٹریجڈی سے بچانا چاہتا ہے اور زندگی اپنی مسرتوں سے اُسے محروم رکھتی ہے"۔

اب مجھ پر دفعتًا افسردگی سی طاری ہونے لگی، میں نے کہا کہ :- "آؤ ان ساحلوں سے دور کہیں اور نکل چلیں، یہاں کی فضا ایسی نہیں کہ میں اپنے سنہرے بال اس میں کھولوں، اور نہ دُنیا اس قابل کہ میں اپنے سینہ کی مقدس عریانی کو اس پر ظاہر کروں"۔

الہامی تعلیمات

میں بہت کمسن تھا، جب مجھ سے کہا گیا کہ وہاں ایک شہر ہے جہاں "الہامی تعلیمات" کے مطابق لوگ زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں نے اپنے جی میں کہا "میں ضرور وہاں جاؤں گا" یہ شہر بہت دور تھا، لیکن میں چل کھڑا ہوا اور چلتا رہا یہاں تک کہ میں جوان ہوگیا۔ جب شہر میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ شہر کے تمام باشندوں کی ایک آنکھ پھوٹی ہوئی اور ایک ہاتھ کٹا ہوا ہے۔

میں نے اپنے جی میں کہا :- "کیا اس شہر مقدس میں رہنے کے لئے یہ شرط ضروری ہے کہ ایک آنکھ اور ہاتھ غائب ہو"۔

اس شہر کے باشندے بھی مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ یہ کیسا آدمی ہے جو دونوں آنکھیں اور دونوں ہاتھ رکھتا ہے۔

وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے کہ میں نے ان سے پوچھا :- "کیا یہی وہ مقدس شہر ہے جہاں لوگ تعلیمات الٰہی کے موافق زندگی بسر کرتے ہیں"۔

آنھوں نے کہا :- "ہاں یہی وہ شہر ہے"

میں نے پوچھا :- "یہ تمہارا کیا حال ہے، تمہاری داہنی آنکھ اور داہنا ہاتھ کیا ہو گیا"۔

انھوں نے یہ سُن کر میری لاعلمی پر افسوس کیا اور کہا :- "آؤ، ہمارے ساتھ چلو اور دیکھو"۔

وہ مجھے ایک معبد میں لے گئے جو وسط شہر میں قایم تھا۔ جب میں اندر گیا تو میں نے دیکھا کہ وہاں نکلی ہوئی آنکھوں اور کٹے ہوئے ہاتھوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا ہے۔ میں نے گھبرا کر پوچھا "خدا کے لئے بتاؤ یہ کیا ماجرا ہے، یہ کس ظالم و سفاک نے تمہارے ہاتھ کاٹ ڈالے، وہ کون بے رحم تھا جس نے تمہاری آنکھیں نکلوالیں"۔

یہ سُن کر ان میں سے ایک معمر شخص میری طرف آیا اور بولا کہ :- "یہ ہم نے خود ہی ایسا کیا ہے"۔

یہ کہکر وہ مجھے قربانگاہ پر لے گیا اور اشارہ کر کے کہا کہ اس قربانگاہ کے اوپر جو آیت درج ہے اُسے پڑھو، میں نے پڑھا، یہ لکھا ہوا تھا :-

"اگر تیری داہنی آنکھ تجھے شک میں مبتلا کرے، تو اُس کو نکال ڈال، کیونکہ بھلائی اسی میں ہے کہ ایک عضو جاتا رہے اور سارا جسم آگ کی مصیبت سے بچ جائے۔ اسی طرح اگر تیرا داہنا ہاتھ تجھے شک میں مبتلا کرے تو اُسے کاٹ ڈال کیونکہ بہتری اسی میں ہے کہ تیرا ایک عضو ہلاک ہو جائے، اور سارا جسم جہنم کی آگ میں نہ ڈالا جائے"۔

میں نے یہ آیت پڑھکر دریافت کیا :- "کیا تمہارے شہر میں کوئی انسان ایسا نہیں جس کی دونوں آنکھیں اور دونوں ہاتھ سالم ہوں"۔

انھوں نے جواب دیا "سوا چھوٹے بچوں کے کوئی شخص ہم میں ایسا نہیں جس کے تمام اعضا سالم ہوں، لیکن جس وقت یہ بچے بھی بالغ و ذی شعور ہوں گے اور کتاب مقدس پڑھنے کے قابل ہوں گے تو یہ بھی ایسے ہی ہو جائیں گے"۔

یہ سُن کر میں وہاں سے بھاگا کیونکہ میں اب بالغ و ذی شعور تھا اور کتاب مقدس بھی پڑھ سکتا تھا۔

ذہنی غلامی

میں نے ایک آئینہ کرہ دیکھا۔ جس کے وسط میں میز پر کرۂ زمین رکھا ہوا تھا۔ ساکن، سنگین اور بے حس اور اس کے چاروں طرف چار مجسمے سنگِ مرمر کے قایم تھے جن کی نگاہیں کرۂ ارض پر جمی ہوئی تھیں۔

ایک مجسمہ ترکستان کے اس قہرمان اعظم کا تھا جس کی تلوار سے ہمیشہ آگ کی چنگاریاں نکلتی تھیں، دوسرا یونان کے اس قائد اکبر کا تھا۔ جس کے گھوڑے نے ایک عالم کو پامال کر کے رکھدیا تھا، تیسرا روما کے اس فرمانروا کا تھا جو آگ کی لپٹوں میں بھی خاص موسیقی محسوس کرتا تھا، چوتھا کسی مذہبی قائد و رہنما کا تھا، ہاتھ میں عصا، انگلیوں پر تسبیح، لانبی داڑھی، طویل عبا، جھکی ہوئی کمر اور چہرہ شکنوں سے بھرا ہوا۔

ایک مجسمہ نے کرۂ زمین سے مخاطب ہو کر کہا :- "کیا تو پھر ایک بار مجھے اپنے اوپر حکمرانی کی اجازت دے سکتا ہے"۔

کرۂ زمین :- "کوئی حرج نہیں، میری پیٹھ اس بار کو پھر سنبھال لے گی"۔

دوسرا مجسمہ :- "مجھے ایک بار اپنی فضا میں آنے کی اجازت دے"

کرۂ زمین :- "مناسب ہے، آپ بھی آئیے میں پھر اس تلخ تجربہ کو برداشت کر لوں گا"۔

تیسرا مجسمہ :- "تو کیا میں محروم رہوں گا؟"
کرۂ زمین :- "آپ بھی سہی، میں جسمانی غلامی کو ایک بار پھر گوارا کر لوں گا۔"
چوتھے مجسمہ نے اپنی مرتعش آواز سے پوچھا "اور میں؟"
کرۂ زمین یہ سُن کر کانپنے لگا اور بولا کہ :- "معاف فرمائیے، ذہنی غلامی ایک بار سے زیادہ قابلِ برداشت نہیں۔"

تصوف

ایک شام میں تصوف کی ایک کتاب پڑھتا ہوا سو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کہ دفعتًا ایک دیوانہ میرے پاس آیا جس کے بال اُلجھے ہوئے اور کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔
آتے ہی مجھ سے سوال کیا "تم کون ہو" ——— میں نے کہا :- "مجھے نہیں معلوم"
بولا :——— "تم میرے بندے ہو، میں تمہارا خدا ہوں" ——— میں نے کہا :- "ہو سکتا ہے"
غضبناک ہو کر بولا :- "کیسے ہو سکتا ہے، تم میرے خدا ہو، میں تمہارا بندہ ہوں" ——— میں نے کہا :- "ممکن نہیں"
بولا :——— "نہیں یہ بھی غلط ہے، تم میں ہو، میں تم ہوں"
میں نے کہا :——— "اگر تم ہوتے اور میں میں تو کیا ہوتا"
بولا :——— "نہ پھر خدا خدا ہوتا، نہ بندہ بندہ"
میری آنکھ کھلی تو سر درد کر رہا تھا اور دماغ بے کار تھا۔

قزاق کی نماز

شام کا وقت تھا اور سنسان صحرا سے تھکا ہوا قافلہ اس طرح خاموشی سے گزر رہا تھا۔ گویا کہ اس میں جان نہیں، اور کوئی زبردستی اسے گھسیٹے لئے جاتا ہے۔ منزل دور تھی اور شفق کی سرخی سیاہی میں بدلنا شروع ہو گئی تھی ——— میر کارواں نے افق کی طرف نگاہ ڈالی۔ اور خوف مایوسی کی مشترک کیفیت کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر اونٹ کی رفتار تیز کر دی۔
پہلو سے دفعتًا ایک مسلح گروہ نمودار ہوا۔ اور قافلہ کا محاصرہ کر کے اونٹوں کی کونچیں کاٹنا شروع کر دیں ـــ اسباب معہ سواروں کے اونٹوں کی پیٹھ سے گرنے لگا، عورتیں چیخنے لگیں اور بچے سہم کر اپنی ماؤں کے سینے سے لپٹ گئے۔
قزاقوں کا سردار، جس کی مونچھیں منڈی ہوئی تھیں اور داڑھی سینے تک پھیلی ہوئی، جس کے گلے میں تسبیح تھی اور پیشانی پر سجدہ کا سیاہ نشان نمودار، غضبناک ہو کر آگے بڑھا اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ سب نیزوں پر رکھ لیا جائے اور خود تلوار لے کر عورتوں کے ہجوم میں گھس گیا۔ یہ بچوں کو ماؤں کے سینے سے زبردستی کھینچ کھینچ کر زیور کھسوٹ رہا تھا ——— ـــ تلوار کی دھار سے کاٹ کاٹ کر، اپنے قوی ہاتھ سے توڑ توڑ کر۔ اور جو عورت مزاحمت کرتی تھی اس کے سینہ میں تلوار پیوست کر دیتا تھا، یہاں تک کہ اس کے ہاتھ پاؤں کی جنبش مفقود ہو جاتی ـــ اس نے عبا کی جیبیں زیوروں سے بھر لیں، بڑی بڑی آستینیں زر و سیم کے بوجھ سے لٹک پڑیں ـــ دفعتًا دور سے اذان کی آواز آئی اور یہ سب کو اسی طرح مجروح و خونچکاں حالت میں چھوڑ کر قریب کے چشمہ پر گیا تاکہ وضو کر کے نماز پڑھے اور اپنے دامن سے خون کے دھبے دھو رہا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ۔ "خدا غارت کرے ان کو، میرے کپڑے بھی خراب کر دئے اور نماز بھی قضا کرا دی"۔

دردِ رائگاں

(فضا ابن فیضی)

اب درخورِ تماشا دن ہے نہ رات تیری
اک "دردِ رائگاں" ہے یہ کائنات تیری

تکلیفِ آگہی ہے یہ رنگ و بو کا عالم
خونیں کفن ہے لالہ، دہکی ہوئی ہے شبنم

کانٹوں کو پوجتی ہے روحِ بہار کیا کیا
صحنِ چمن میں گل کو ہے انتشار کیا کیا

جوشِ گداز پر ہیں آمادہ آبگینے،
گردابِ خسروی میں محصور ہیں سفینے

بیگانۂ سحر ہیں خود آفتاب کتنے،
مٹی میں مل گئے ہیں سرو و گلاب کتنے

خورشید و ماہ کتنے محرومِ جستجو ہیں
اف! کیا یہی اندھیرے صبحوں کی آبرو ہیں

ابلیس لکھ رہا ہے تقدیرِ ابن آدم
زخموں کو کھا گیا ہے "حسنِ یقیں" کا مرہم

چہرے کی یہ صباحت، ماتھے کی یہ سیاہی
بے سوزِ آگہی ہیں ہیرانِ خانقاہی

تا کے متاعِ ہستی صرفِ زیاں رہے گی!
تا چند روحِ آدم محوِ فغاں رہے گی!

مری تشنگی بھی لیکن لبِ جام تک نہ پہونچے

جناب یحییٰ جسدنوالا (بمبئی)

"مشکل زمین میں شعر کہنا مشکل ہے لیکن غزل کہنا اس سے زیادہ مشکل ـــــ اور اگر کوئی شاعر اس میں کامیاب ہو جائے تو اس کی فکر کی داد دینا ہی پڑتی ہے"

پئے جلوہ آرہے ہیں وہ مگر جھجک جھجک کر
کہ نگاہِ شوق میری کہیں، بام تک، نہ پہونچے

جو نہیں ہیں تشنہ ان کے لئے جام پے بہ پے ہیں
مری تشنگی بھی لیکن لبِ جام تک نہ پہونچے

ہے ترے مریضِ الفت کی سحر سے غیر حالت
میں سمجھ رہا ہوں شاید کہ وہ شام تک نہ پہونچے

یہ ازل ہے کیا ابد کیا ادھر آؤ میں بتاؤں
مری صبحِ نامرادی ہے جو شام تک نہ پہونچے

رہِ منزلِ وفا کا یہ عجیب ماجرا ہے
دمِ صبح جو چلے تھے وہی شام تک نہ پہونچے

نہ کسی سے کوئی رد تھے مگر اس طرح بھی یحییٰ،
کہ سبیلِ عذر خواہی میں سلام تک نہ پہونچے

فلسفۂ زندگی

(شاہ خلیل الرحمٰن عارق)

زندگی کیا ہے ؟ بتاؤں میں حقیقت اس کی
زندگی کیا ہے ؟ مگر لمعۂ نورِ یزداں
دیکھ پائی تھی جھلک تب ہی تو سرمستی ہے
کبھی احرام سماوی کے وہ نوری اجسام
کبھی عشرت کدۂ ناز میں تصویرِ نشاط
قصرِ رومہ کی ہے تعمیر میں مظلوم کا خون
کبھی یرموک و جلولا میں اخوت کا درس
بدر کے معرکہ میں وہ بنی تعمیرِ امم
کبھی ہٹلر، کبھی چرچل، کبھی اسٹالن ہے
جوش و سرمستی کے اظہار میں رومی کا کلام
کبھی آزاد کی تقریر میں اک سحرِ حلال
میر کے حزن و انشا کے تمسخر میں نہاں
وہ نظر آتی ہے قرآن میں ہادیِ امم
حسنِ لیلیٰ و قلوپطرہ و عذرا میں عیاں،
"اک معمّٰی ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا"
ہم کو منظور نہیں فلسفۂ مِل ہرگز

گرچہ میں شاعر و ملا ہوں نہ عالم، نہ ادیب
جس کی تنویر سے ہر ذرّہ کو بہرہ و نصیب
رقصِ پیہم میں ہیں ذرّات بہیات عجیب
سطحِ گیتی پہ کبھی بحر و بیابانِ مہیب،
کبھی چنگیز و ہلاکو کا ہے تاراج و نہیب
اور "بگ بن" میں نظر آئی وہ اک دجل و فریب
علقمی، صادق و جعفر کا کبھی عذر و فریب
کبھی غرناطہ و دہلی میں وہ درجہ تخریب
شکلِ گاندھی میں کبھی امن کی داعی و نقیب
بادۂ حافظ شیراز میں کیا بے تشبیب
اور غالب کے تخیل میں ہے پرواز عجیب
اور تورات و اناجیل میں بیجا تبویب
عشقِ مجنوں و انتونی و دوامق کے قریب
قول فانی نظر آتا ہے حقیقت کے قریب
گرچہ چکبست کا بھی قول اسی کے ہے قریب

"زندگی کیا ہے عناصر کا ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

ادیب سہارنپوری

میں تو رنگِ سحر و شام، سمجھتا تھا اسے
نکہت و رنگ کا موسم جسے کہتے ہیں بہار
ہمیں ساری زندگی میں یہی یاد رہ گیا ہے،
میں گزر رہا ہوں دیکھو، بڑے سخت مرحلوں سے
طلبِ سکون و راحت ۔ ہے وہاں ادیبؔ کو

زیست ہے تیری تمنا مجھے معلوم نہ تھا
نام تھا تیری ہنسی کا مجھے معلوم نہ تھا
کہ ہنسے تھے دو گھڑی کو کبھی تیرے ساتھ ہم بھی
مرے ساتھ ساتھ کیا تم نہ چلو گے دو قدم بھی
کہ جہاں بقدرِ خواہش نہ ملا کسی کو غم بھی

(ساحر بھوپالی)

نہ آیا جب پذیرائی کو کوئی دشت و حشت میں
تو اپنے نقشِ پا پر آپ سجدہ کر لیا میں نے

قیامت خیز اگر طوفانِ غم اُٹھا تو کیا پروا
کہ ابتو ڈوب کر پیدا کنارا کر لیا میں نے

یہی کیا کم سزا ہے بیکسیِ عشق کی ساحر
کہ اُن سے چھٹ کے بھی جینا گوارا کر لیا میں نے

نظر سے پرسشِ غم بار بار کیا کہنا
یہ پاسِ خاطرِ امید وار کیا کہنا،

مرنا ہی پڑا مجھکو جینے کے لئے ساحر
الزام کرم آتے جب حسن کے سر دیکھا

اپنے ہی سر لیا الزام تباہی میں نے
مجھ سے دیکھا نہ گیا اُن کا پشیماں ہونا

زمانہ کچھ بھی کہہ لے، کچھ بھی سمجھے، کچھ نہیں پروا
مگر وہ تو ابھی تک مجھ کو دیوانہ نہیں کہتے

تابِ نظارہ جب نہیں، پھر بزمِ نازمیں
کس منھ سے لے کے دید کا ارمان جائیے

دل توڑ کر نہ جائیے، ساحر کا اس طرح
برباد آرزو کا کہا مان جائیے

(سرور بارہ بنکوی)

تا کے ہم گردشِ ایام کی باتیں کریں،
آؤ کچھ خوبانِ گل اندام کی تیں کریں

پھر کسی کی جلوہ آرائی کی چھیڑیں داستاں
اور نگاہِ موردِ الزام کی باتیں کریں

پھر لب و رخسار کی رنگینیوں میں ڈوب کر
لذتِ یک جرأتِ بدنام کی باتیں کریں

پھر بیادِ عیش دیرینہ بنامِ گلرخاں،
شیشہ و ساغر سبو و جام کی باتیں کریں

عظمتِ فردوسی و رومی بجا لیکن سرور
آؤ اِس شب حافظ و خیام کی باتیں کریں

(اکرم دھولیوی)

سنتے ہیں آجکل کہ انھیں بھی نہیں قرار
حسرت نصیب دل کا تڑپنا بُرا ہوا

سنبھلتی جا رہی ہے ہر قدم پر زندگی میری
گزرتا جا رہا ہوں رنج و راحت کے مراحل سے

طبیعت یوں بدل جائیگی کیا معلوم تھا ہمکو
کہ اب تو درد کا احساس بھی ہوتا ہے مشکل سے

سکون آمیز ہے کتنا غمِ انسانیت اکرم
نشاطِ دردمندی کو کوئی پوچھے مرے دل سے

قاسم شبیر نقوی (نصیر آبادی)

یہ دیر و کعبہ کی منزلیں تو فقط "گزرگاہِ بندگی" ہیں
جہاں پہ سجدے ہیں بیخودی کے، وہاں کوئی آستاں نہیں ہے

تباہیوں کا خیال کیوں ہے چمن کی رونق بڑھانے والو!
جو بجلیوں کو نہ آزمائے وہ آشیاں، آشیاں نہیں ہے

تیری تلاش، تیری طلب، تیری آرزو
لائی وہاں، جہاں یہ "وجود و عدم" نہیں،

وہ دن گئے کہ زندگیِ دل پہ ناز تھا
مدت ہوئی کہ غم تو ہے احساسِ غم نہیں

ہم جہاں کاوشِ نظارہ سے درگزرے ہیں
چند ایسے بھی مقاماتِ نظر گزرے ہیں،

ہائے یہ "حسرتِ آوارہ" ترے کوچہ میں
خود کو کھویا ہے ہر اک بار، مگر گزرے ہیں

طوفاں کی شورشیں پھر آواز دے رہی ہیں
تو میں تو باز آیا ساحل کی زندگی سے

میں گلوں کے حسن و شباب ہی کی لطافتیں نہیں دیکھتا
جسے باغباں نے مسل دیا وہ کلی بھی میری نظر میں ہے

(شفقت کاظمی) رنگِ حسرت

منزل ہے نظر میں اب نہ جادہ — سرگرمِ سفر ہوں بے ارادہ
غمزہ بھی ترا ہے خوب لیکن — کچھ اور تھی وہ ادائے سادہ
واقف ہوں فریبِ دوستی سے — اظہارِ کرم نہ کر زیادہ
اب یہ اپنے سے ہے گلہ ہم کو — تجھ سے کیوں رسم و راہ پیدا کی
میرے دل کی خرابیوں پہ نظر — اُس نے جب کی تو بے محابا کی
ہم سے ترکِ وفا پہ بھی نہ چھٹی — آرزو اُس جمالِ رعنا کی

(جوہر ٹونکی)

اشک آنکھوں میں نہ سینے میں نفس باقی ہے — کارواں ہے نہ اب آوازِ جرس باقی ہے
رخ ذرا سوچ کے گلشن کا کرے برق تپاں — اب بھی گلشن میں کوئی شعلۂ نفس باقی ہے
جاں اور بھی دیتے پر دانے جوش اپنا دکھاتے دیوانے — آغازِ کارِ رنگِ بزم مگر افسوس کہ آخرِ شب نہ رہا

(سعیدہ اختر)

نشۂ بادۂ بے نام کوئی کیا جانے؟ — نرگسِ یار کا انعام کوئی کیا جانے؟
تجھے ہر اک ذرہ میں رقصاں مہ و انجم لاکھوں — دل لگانے کا وہ ہنگام کوئی کیا جانے؟

(سعادت نظیر)

جو ٹوٹ جائے مرا جام تو بھی غم کیا ہے — تمہاری ایک نگہ اور ہزار پیمانے!
ترے تبسمِ ظاہر کو دیکھنے والے! — جو میرے دل پہ گزرتی ہے، تو وہ کیا جانے!

(ڈاکٹر متین نیازی)

یوں تو ہر شے میں نظر آتا ہے ان کا جلوہ — وہ تصور میں جو آجاتے تو ہم کیا کرتے
جرأتِ ترکِ تمنا کا یہ انجام، متین — زندگی گزری ہے تجدیدِ تمنا کرتے

(شوکت پردیسی)

مدت ہوئی نہ جانے مجھے کس خیال میں — آئی تھی اک ہنسی بڑی سنجیدگی کے ساتھ
شوکت! اسی حیات کے لمحوں میں بار ہا، — ہنسنا پڑا ہے مجھ کو بھی سب کی ہنسی کے ساتھ

مطبوعاتِ موصولہ

زرِ داغِ دل

اس کتاب کا نام بھی عجیب ہے، موضوع و مفہوم بھی عجیب اور طباعت و کتابت بھی ویسی ہی — ظاہری خوبی تو یہ کہ سرورق بہت پاکیزہ جلد نہایت نفیس، اور کاغذ و طباعت (ٹائپ) نفیس تر اور مفہوم و طرزِ ادا کے لحاظ سے خدا جانے کیا۔

یہ مجموعہ ہے جناب خالد عزیز کی دس معرّیٰ منظوم ڈراموں کا جو عنوان کے لحاظ سے سب کی سب ادبی ہیں اور مفہوم و معنی کے لحاظ سے تاریخی، اخلاقی اور رومانی سب کچھ ہیں۔

ابتدا میں "صریرِ خامہ" کے عنوان سے جو نظم لکھی گئی ہے وہ تو ضرور ردیف و قافیہ کی گرانبار ہے۔ ورنہ باقی تمام نظمیں اس قید سے آزاد ہیں۔ جو "وزن و ایقاع" بھی رکھتی ہیں۔ گو کہیں کہیں اس طوق کو بھی اتار کر پھینک دیا گیا ہے۔

جناب خالد عزیز اپنی تصویر میں بڑے اچھے قیافہ کے انسان معلوم ہوتے ہیں، لیکن کچھ جھنجھلائے ہوئے سے۔ لیکن اپنی تحریر میں وہ یکسر سیل رواں ہیں گو کہیں کہیں اس کی موجیں چٹانوں اور پتھروں سے بھی ٹکرا جاتی ہیں۔

ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ کافی مطالعہ کے بعد انھوں نے شعر کہنا شروع کیا اور ہو سکتا ہے کہ شاعری انھوں نے اسی وقت شروع کی ہو جب وہ مطالعہ سے گھبرا چکے تھے۔ فارسی، عربی الفاظ کا استعمال انھوں نے جس صحت کے ساتھ کیا ہے کہ وہ آج کل کے شعراء میں کم نظر آتی ہے۔ گو کہیں کہیں وہ جوش میں رمزیات، اشارات، حسیات وغیرہ کے ساتھ "نگارشات" بھی لکھ جاتے ہیں۔ اخیر میں انھوں نے "عرضِ تمنا" کے عنوان سے اپنے ادبی مسلک میں بھی روشنی ڈالی ہے، لیکن اس قدر عمیق فلسفیانہ انداز میں کہ اگر کوئی شخص پہلے اسے پڑھ لے تو شاید اصل کتاب کے پڑھنے کی جرأت نہ کرسکے۔

ڈرامہ کی زبان عموماً وہی ہوتی ہے جو عام بول چال اور نظم معرّیٰ میں اسی لئے زیادہ موزوں سمجھی جاتی ہے کہ ردیف و قافیہ کی عدم پابندی کی وجہ سے اس میں بیان کی وسعت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے، لیکن چونکہ خالد صاحب کے ڈرامے موضوع و خیال کے لحاظ سے بڑی حد تک "ماورائیات" سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے ان کے "مکالمات" میں "الوہیات و لاہوتیات" کا پایا جانا ضروری تھا، خواہ "ایقاعیات" کی پابندی ان میں ہو یا نہ ہو۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب ہر لحاظ سے بڑی مرعوب کن چیز ہے اور اس "زرِ داغِ دل" کو دیکھ کر بے اختیار مجھے غالب کا یہ شعر یاد آجاتا ہے:۔

جو نفسِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے بزبانِ بیزبانی

کراچی کے "مکتبۂ شعور" نے اسے شایع کیا ہے اور کتاب کے جملہ محاسن کو دیکھتے ہوئے اس کی قیمت دس روپیہ بیجا نہیں ہے۔ اس مکتبہ کا پتہ:۔ "مانڈوی والا لین پریڈی اسٹریٹ" ہے۔

گلِ نخستین

مجموعہ ہے جناب ابوظفر نازش رضوی کی فارسی نظموں اور غزلوں کا جسے خود انھوں نے بڑے اہتمام سے نہایت نفیس کاغذ پر ٹائپ کے حروف میں شایع کیا ہے۔ جناب نازش اورینٹل کالج لاہور کے منتہی طالب علم ہیں اور فارسی زبان سے بڑا شغف رکھتے ہیں۔ دوسری زبانوں کی طرح فارسی ادب میں بھی بڑا انقلاب ہوا ہے اور اس کا موجودہ لٹریچر کلاسکی ادب سے بہت مختلف ہے

خیال و زبان دونوں حیثیتوں سے ۔ اس لئے اس وقت غیر ایرانی طلبہ ہمیشہ ایران کے انقلابی عہد کے ادب ہی کو زیادہ قابل توجہ سمجھتے ہیں، اور وہاں کے کلاسکل ادب کو نظر انداز کر دیتے ہیں، لیکن نازش صاحب کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کلاسکل فارسی کا بھی "کار آگہانہ" مطالعہ کیا ہے اور جدید فارسی کا بھی ۔

جناب نازش کا رجحان نظم نگاری کی طرف زیادہ ہے اور غزل کی طرف کم، اسی لئے ان کے کلام میں الفاظ کا "تراکم" زیادہ پایا جاتا ہے اور ذہنی ترنم کم ۔ ان کی نظموں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے کوئی خاص خاکہ (PHTTERN) اپنے سامنے رکھ لیتے ہیں اور پھر اس میں رنگ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں یعنی وہ آرٹسٹ شاعر تو ضرور ہیں، لیکن "خلاق" اور "بتدیع" آرٹسٹ نہیں، ان کی شاعری محض زبان کی میکانکی شاعری ہے جو یقیناً ایک خاص قیمت رکھتی ہے، خواہ اس میں حلاوت و عذوبت نہ ہو اسلئے جناب نازش کو صرف نظموں کی حد تک اپنی کاوش محدود رکھنا چاہئے تھا ۔

اس میں شک نہیں کہ نازش صاحب موجودہ فارسی کے بڑے اچھے مدرس بن سکتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ اچھا مدرس اچھے شعر نہ کہہ سکے ۔ ہندوستان میں فارسی ذوق بالکل معدوم ہوگیا ہے، لیکن پاکستان میں اس ذوق کو بڑھنا چاہئے اور جناب نازش یقیناً قابل ستائش ہیں کہ ان میں فارسی زباندانی کا یہ شوق بڑے امکانات اپنے اندر رکھتا ہے، جس سے طلبہ کو پورا فایدہ اٹھانا چاہئے ۔

فکر و فن مجموعہ ہے جناب خلیل الرحمن اعظمی کے دس انتقادی مقالات کا جسے آزاد کتاب گھر اردو بازار دہلی نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے خلیل اعظمی کی تنقید نگاری اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب دوسرے اچھے اچھے تنقید نگار میدان میں آچکے تھے اور ان کے سامنے چراغ جلنا آسان نہ تھا، لیکن نہ کوچۂ عشق کی راہیں محدود، نہ جھانک تاک کی ۔ اعظمی اس کوچہ میں آئے اور اس شان سے کہ سب کی نگاہیں ان کی طرف اٹھ گئیں ۔ جنھوں نے نگار میں آتش پر ان کے انتقادی مقالات کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اعظمی کی آمد اس میدان میں کیسی دھوم دھام کی تھی ۔

اس سے پہلے شاید ان کا کوئی انتقادی مقالہ شایع نہیں ہوا تھا اور اگر ہوا بھی ہو تو میری نگاہ سے نہیں گزرا ۔ بہرحال آتش پر جب ان کا مقالہ مجھے ملا تو بے اختیار نسبتی کا یہ شعر یاد آگیا کہ :-

موقوف بہ خنجر دگر شد آسایشِ نیم بسملِ ما

انتقادیات کی ٹھہری ہوئی فضا اس وقت واقعی "آسایشِ نیم بسملِ" کی کیفیت رکھتی تھی اور اس کے لئے "خنجر دگر" کی ضرورت تھی ۔ پھر اس کے بعد تو اعظمی کے ان واروں کا سلسلہ شروع ہوگیا، جن میں سب سے زیادہ بھرپور وار وہ تھا جس نے جوش کو ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا کر دیا ۔ پھر اعظمی کی خصوصیت صرف آتش نفسی اور آتش باری ہی نہیں بلکہ "نسیم دزی" و "شبنم آسودگی" بھی ہے جس سے ظفر اور درد کے باب میں انھوں نے کام لیا ہے ۔

اس کتاب میں غالب، داغ، مومن، جمیل مظہری، مجاز اور جذبی پر بھی انھوں نے اظہار خیال کیا ہے، کہیں پوری طرح کھل کر اور کہیں ذرا ہچکچائے ہوئے، لیکن جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ "ورزش ایمان بالغیب" نہیں اور اسی لئے اس میں کیفیت "دوٹوک" کی سی پائی جاتی ہے جو مجنوں کے سوا دوسرے تنقید نگاروں میں کم نظر آتی ہے ۔

ضخامت ۲۵۴ صفحات ۔ قیمت تین روپیہ ۔

اردو کی کہانی پروفیسر سید احتشام حسین کی تصنیف ہے جس کا خطاب بچوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں سے ہے اس میں انھوں نے اردو زبان کی ابتدا سے لیکر عہدِ حاضر تک تمام ادوار پر نہایت سہل و آسان زبان میں صحیح معلمانہ انداز سے تبصرہ کیا ہے اور اس قدر جامعیت کے ساتھ کہ نثر و نظم کا کوئی پہلو نہیں چھٹا ۔

یہ کتاب نہ صرف بچوں بلکہ اس زمانہ کے اسکول و کالج کے طلبہ کے لئے بھی مفید ہے، جو اردو کا مطالعہ صرف ضرورتاً کرتے ہیں ۔

اس کا حجم ۱۱۲ صفحات ہے - قیمت عہ - ملنے کا پتہ :- دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ -

ادب کا مقصد

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے آٹھ انتقادی مضامین کا مجموعہ ہے - پہلا مضمون ادب کی مقصدیت سے تعلق رکھتا ہے دوسرا استاد ذوق سے، تیسرے اور چوتھے مقالے میں مومن کی شاعرانہ خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے - پانچویں میں غالب کا ذکر ہے اور چھٹے میں اقبال کے بعض نظریوں کا، ساتواں مقالہ خطوط واجد علی شاہ پر ہے اور آٹھواں عروض پر -

اس مجموعہ میں تمام مقالے اپنی اپنی جگہ خوب ہیں، خصوصیت کے ساتھ آٹھواں مقالہ کہ اس کی افادیت سے کسی کو انکار ہی نہیں ہوسکتا - ساتواں مقالہ اگر اس مجموعہ میں شامل نہ ہوتا تو بہتر تھا، کیونکہ خطوط واجد علی شاہ میں کوئی بات ایسی نہیں کہ ان کے مطالعہ و تنقید پر اتنا وقت ضایع کیا جاتا - ضخامت ۲۲۴ صفحات - قیمت عہ - ملنے کا پتہ :- ادارۂ فروغ اردو - امین آباد - لکھنؤ

اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصۂ دوم

پروفیسر عبدالشکور (اسلامیہ کالج اٹاوہ) کی تالیف ہے، جس میں انھوں نے عہدِ حاضر کے ۲۴ تنقید نگاروں کا ذکر کیا ہے -

اس کتاب میں فاضل مصنف نے ان تمام نقادوں کے کارناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ ان کی خدمات کی نوعیت و اہمیت کیا ہے اور وہ کس نقاد سے کس حد تک متاثر ہوئے ہیں -

اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے موجودہ تنقیدی ادب کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے اور جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ دوسروں کی رائے سے متاثر ہوئے بغیر لکھا ہے - کتاب کے اخیر میں ان کا تبصرہ گویا ساری کتاب کا خلاصہ ہے اور بہت خوب ہے -

اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب عہدِ حاضر کے تمام معروف و غیر معروف نقادوں کے نام اور ان کی ادبی خدمات کا علم حاصل کرنے کے لئے بڑی مفید و کارآمد چیز ہے اور اگر اس میں کوئی کمی ہے تو صرف یہ کہ اس میں ان کا نام ہمیں کہیں نہیں ملتا، حالانکہ ایک نقاد کی حیثیت سے وہ بھی ایک خاص درجہ رکھتے ہیں - ضخامت ۲۸۰ صفحات - قیمت ہے - ملنے کا پتہ :- ادارۂ فروغ اردو - امین آباد - لکھنؤ

اردو شاعری کی روایات

مجموعہ ہے جناب شارق میرٹھی (پرنسپل رحمانیہ کالج مودہا) کے بارہ انتقادی مضامین کا جو مختلف رسایل میں شایع ہو چکے ہیں - سب سے زیادہ طویل مضمون وہ ہے جس میں انھوں نے "احسن مارہروی" کا مطالعہ ان کے خطوط سے کیا ہے - یہ مضمون بڑے خلوص و محبت سے لکھا گیا ہے اور بہت دلچسپ ہے

غالب کی شخصیت، حالی کی شاعری، ادب کے جدید میلانات، اردو شاعری کی روایات اور اسی طرح کے دوسرے عنوانات پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہر چند بہت مختصر ہے لیکن افادہ سے خالی نہیں - شارق صاحب بڑے اچھے سخن گو و سخن فہم انسان ہیں لیکن شعر و شاعری کے اس ہنگامہ سے ہمیشہ علحدہ رہے ہیں، جس میں ورزش و شناوری کا مظاہرہ ضروری ہے - وہ بہت سنجیدہ انسان ہیں اور ان کی یہی سنجیدگی ان کے مضامین کی جان ہے -

ضخامت ۱۲۸ صفحات اور قیمت دو روپیہ - مرکز ادب رحمانیہ کالج رگولی (ہمیر پور) سے مل سکتی ہے -

سرودِ نو

مجموعہ ہے پروفیسر اختر قادری کی نظموں اور غزلوں کا - قادری صاحب مظفر پور کے کالج میں اردو فارسی شعبوں کے صدر ہیں، لیکن ادبیات سے ان کا ذوق صرف معلمانہ نہیں بلکہ ملہمانہ بھی ہے، یعنی وہ پروفیسر ہونے کے بعد شاعر نہیں بنے، بلکہ اس سے قبل ہی وہ شاعر تھے - اول اول ان کی شاعری قنوطی انداز کی تھی لیکن بعد کو رفتہ رفتہ ان کی شاعری ایک معتدل حالت پر آگئی اور وہ عشقیہ شاعری کے ساتھ ساتھ سنجیدہ و مفکرانہ شاعری بھی کرنے لگے -

ان کی شاعری کے تعارف کے سلسلہ میں پروفیسر سید عطاء الرحمٰن، حضرت اثر لکھنوی اور حضرت مسلم نے جو کچھ لکھا ہے وہ بڑی حد تک صحیح ہے - ان کی شاعری احساس و تاثر کی شاعری ہے اور اسی لئے اسے جاندار ہونا چاہئے -

قیمت تین روپیہ اور ملنے کا پتہ :- کاشانۂ ادب لہریا سرائے (دربھنگا)

سروشِ ہستی

جناب شاد عظیم آبادی کے ۴۰ قطعات کا مجموعہ ہے جسے کتاب منزل پٹنہ نے بڑے سلیقہ و اہتمام سے شایع کیا ہے اس میں پروفیسر محمد ذکی الحق کا مقدمہ بھی شامل ہے جس میں انھوں نے فن قطعہ نگاری پر بحث کرتے ہوئے شاد کے قطعات پر تفصیلی نگاہ ڈالی ہے۔ شاد بڑے مرتبہ کے شاعر تھے اور جس صنف سخن میں فکر کرتے تھے اس پر چھا جاتے تھے، مرثیے لکھے تو اسی شان کے، رباعیاں لکھیں تو اسی رنگ کی اور قطعات لکھنے پر آئے تو قطعہ نگاری کا حق ادا کر دیا۔ یہ قطعات زیادہ تر مذہبی، اخلاقی یا تاریخی انداز کے ہیں لیکن بیان و زبان کی خصوصیات کے لحاظ سے وہ بڑی قیمتی ادب پارے بھی ہیں۔ یہ کتاب ہے میں مل سکتی ہے۔

انتخاب کلام آتش

کلام آتش کا یہ انتخاب ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کی کاوش کا نتیجہ ہے جسے ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد نے خاص اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے۔ فاضل مرتب نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ انتخاب مشکل کام ہے کیونکہ انتخاب کرنے والا زیادہ تر اپنے ہی ذوق کو سامنے رکھتا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف نے محض اس خیال سے کہ آتش کا ہر رنگ انتخاب میں آجائے اپنے اوپر جبر کر کے بعض ایسے اشعار بھی لے لئے جو کسی طرح انتخاب کے قابل نہ تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک بسیط مقدمہ بھی شامل کر دیا ہے جس سے آتش کے مطالعہ میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ ضخامت ۱۴۰ صفحات قیمت ۴ عہ

مضامین ڈار

مجموعہ ہے پروفیسر محمد ابراہیم ڈار (مرحوم) کے نو تحقیقی مقالات کا جسے کرنٹ بک ہاؤس بمبئی نے شایع کیا ہے۔ پروفیسر ڈار اسماعیل کالج بمبئی کے بڑے مشہور پروفیسر تھے اور اپنے خالص علمی ذوق کی وجہ سے بڑے مرتبہ کے محقق سمجھے جاتے تھے عربی، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں کے فاضل تھے اور تاریخی و ادبی تحقیق ان کی زندگی کا تنہا مشغلہ تھا۔ انھوں نے سلسلۂ تحقیق میں بہت سے مضامین لکھے جن میں کچھ شایع ہوئے۔ اور اب اسی کالج کی ایک کمیٹی ان مقالات کو کتابی صورت میں شایع کرنے پر آمادہ ہوئی ہے جس کی پہلی قسط یہ کتاب ہے، اس میں ان کے نو مقالے شامل ہیں جو جہاں آرا بیگم ایک غیر معروف تصنیف "صاحبیہ" - شیخ فریدالدین عطار - حیات شبلی - اقبال - المعتمد علی اللہ اور باقر علی ترمذی سے متعلق ہیں اور سب کے سب اپنی جگہ بڑی افادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ کی قیمت پانچ روپیہ ہے اور ضخامت ۲۹۴ صفحات۔ ملنے کا پتہ یہ ہے:- کرنٹ بک ہاؤس - ماروتی لین - رگھوناتھ داداجی اسٹریٹ - بمبئی۔

وحدت الوجود اور توحید اسلامی (حصۂ اول)

تصنیف ہے جناب کے، عبدالرحمان عمری کی جس میں انھوں نے اکابر علماء اسلام کے اقوال سے ثابت کیا ہے کہ "وحدت الوجود" غیر اسلامی نظریہ ہے اور اسلامی نظریۂ توحید سے وہ کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

صاحب موصوف نے اس رسالہ کے پہلے حصہ میں ظاہر کیا ہے کہ صوفیہ کے اکثر نظریے یونانیوں سے ماخوذ ہیں اور تعلیم اسلام سے وہ کوئی واسطہ نہیں رکھتے، دوسرے حصہ میں ہندوؤں کے فلسفہ کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے بعد وحدت الوجود کی مختصر تاریخ بتا کر، توحید کے صحیح تصور اور خدا و کائنات کے تعلق کو ظاہر کیا گیا ہے۔ تنوع مباحث کے لحاظ سے یہ گفتگو بڑی تفصیل چاہتی تھی، قابل مصنف نے صرف ۴۸ صفحات میں ان سب کا خلاصہ اس طرح پیش کر دیا ہے کہ ہم بحث کی نوعیت سے پوری طرح آگاہ ہو جاتے ہیں۔

میں مصنف کا بالکل ہم خیال ہوں کہ اسلام اور تصوف دو بالکل جدا چیزیں ہیں، لیکن میں یہ تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں کہ تصوف، اسلام کے منافی ہے بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر متصوفانہ عنصر کو اسلام سے علحدہ کر دیا جائے تو وہ صرف خیال کا مذہب رہ جاتا ہے مفکرین کا نہیں۔

ابتداء عہد اسلام کے عقاید میں تو زمانہ کے ساتھ ساتھ تغیر ہونا ہی تھا، اس لئے اس کو غنیمت جاننا چاہئے کہ یہ تغیر اسے تصوف کے طرف لے گیا تفلسف کی طرف نہیں۔

قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتہ:- کے عبدالرحمان عمری - ۱۲ - محمد پورہ تیسری گلی آمبور (دکن)

مکتوباتِ نیاز

(تین حصّوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوطِ غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دُور کیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر طبع ہوئی ہے، قیمت ہر حصّہ کی چار روپیہ (علاوہ محصول)

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہاوہان طریقت وعلمائے کرام کی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ، انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت آٹھ آنے (علاوہ محصول)

۵۵ سال کے بعد

ایک بے مثل نفسیاتی مطالعہ جس میں نہایت تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ۵۵ سال کے بعد مسرور زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے زبان و انداز بیان کے لحاظ سے یہ کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ ناول کا سا لطف دیتی ہے۔ یہ کتاب انگریزی زبان کے ایک شاہکار کا ترجمہ ہے۔ قیمت ۱۲ر

مالہ و ما علیہ

حضرت نیاز نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ فن شاعری کس قدر مشکل فن ہے اور اس میدان میں بڑے بڑے شاعروں نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں اور اس کا ثبوت انھوں نے دورِ حاضر کے بعض اکابر شعرا، مثلاً جوش جگر، سیماب وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھ کر پیش کیا ہے، ملک کے نوجوان شاعروں کے لیے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ

شہاب کی سرگذشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے، اس کی زبان تخئیل، اس کی نزاکت بیان اس کی انشا عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے، یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔ قیمت دو روپیہ (علاوہ محصول)

مذاکرات نیاز

یعنی نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس رسالہ کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ جدید ایڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے، ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر مؤرخانہ نظر، اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ، اُردو غزل گوئی پر عہد بہ عہد ترقی، نقش ہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد، فنون، اڈیٹر، حقیقت نگاری۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

فراست الید

اس کے مطالعہ سے ہر ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات و بیماری شہرت و نیک نامی پر پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ

RECD.N-A-9776

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار کے خاص نمبر

سال نامہ ۱۹۲۸ء (مومن نمبر)

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ مومن کے مطالعہ کے لیے اس کا پڑھنا از حد ضروری ہے۔ قیمت دو روپے چار آنہ، علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۳ء (ریاض نمبر)

اس نمبر میں ریاض خیر آبادی مرحوم کے کلام پر ملک متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۴۸ء (پاکستان نمبر)

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپے چار آنہ (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۴۹ء (افسانہ نمبر)

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کیے گئے ہیں۔ اس سال نامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اصول ہیں اور ہر اصول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیئے۔ قیمت دو روپے چار آنہ (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۵۱ء (مشرق وسطیٰ نمبر)

اس سالنامے کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں اڑس ہنڈی کی مشہور عالم کتاب، ایک مستقبل کی تلاش کا ترجمہ اقتباس ہے جس میں اس میں ایران، مصر، عراق فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے، اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے۔ اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں، سالنامہ کا دوسرا حصہ ایڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۲ء (حسرت نمبر)

جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی، حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۵۳ء (داغ نمبر)

(داغ نمبر) جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کیے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے اس نمبر میں قیام رامپور، حیدر آباد کے زمانہ کے علاوہ ان کی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۴ء (فرماں روایان اسلام)

(فرماں روایان اسلام نمبر) یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جس میں ولادت نبوی سے لے کر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر ان کے عروج و زوال کو بتایا گیا ہے، یہ سالنامہ در اصل تاریخی کتاب ہے جو ہر پڑھے لکھے کے پاس ہونا چاہیئے۔ قیمت تین روپیہ چار آنہ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۵ء (علوم اسلامی نمبر)

(علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر) اس تتمہ جس میں اسلامی علوم و فنون پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلم حکومتوں نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا حصہ لیا۔ اس کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے اکابر علم و ادب کے مختصر حالات دے کر ان کی علمی خدمات اور تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔ قیمت تین روپیہ بارہ آنہ علاوہ محصول)

سال نامہ ۱۹۵۶ء (خدا نمبر)

خدا کا تصور عہد تاریک سے لے کر عہد حاضر تک۔ بے مثل تاریخی و تحقیقی تبصرہ مذاہب عالم پر۔ قیمت تین روپیہ چار آنہ (علاوہ محصول)

سال نامہ ۱۹۵۷ء (اصناف سخن نمبر)

غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، مرثیہ وغیرہ جملہ اصناف سخن پر ایک بیش بہا ذخیرہ معلومات۔ قیمت تین روپیہ چار آنہ

منیجر نگار لکھنؤ